عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

فروری ۱۹۳۱ء

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب
اخوندزادہ حسین امام

بدل اشتراک
پانچ روپے 5/-
فی پرچہ آٹھ آنہ
ششماہی
تین روپے

جلد (۴) شمارہ (۲)

محرم الحرام سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

۱	لمعات	ادارہ	۲–۶
۲	دعا	جناب اسد ملتانی	۷–۸
۳	پاپولر	جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز	۹–۲۶
۴	قیاس کن تو کجائی و من کجا واعظ؟	ادارہ	۲۷–۴۴
۵	قربانی کے احکام از روئے قرآن	چودہری غلام احمد پرویز	۴۵–۴۸
۶	عید الضحیٰ کیوں منائی جاتی ہے	حضرت علامہ اسلم صاحب جیراجپوری	۴۹–۵۲
۷	ہمارا تعلیمی نظام	جناب محمد عبدالستار خان صاحب نیازی ایم اے	۵۳–۷۵
۸	حقایق و عبر	ادارہ	۷۶–۸۵

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مرکزِ ملت ← لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ → مرکزِ ملت

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا
اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ
بات تو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کیطرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرے

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اسلئے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا
عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ
(فرمان رسول)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں
لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ
(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت ایکہ گوئی لا اِلٰہ
با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

لمعات

جیسا کہ کسی سابقہ اشاعت میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستان آئین و دستور کی جس کشمکش کے دور سے آج گذر رہا ہے اسمیں مردم شماری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اور آئندہ دس سال کا عرصہ تو ایسا ہے کہ اعداد و شمار کی چھوٹی سی غلطی بھی دور رس نتائج کی منجر ہو سکتی ہے۔ اندریں حالات ضرورت ہے کہ مردم شماری کے موقعہ پہ مسلمان پوری پوری احتیاط برتیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا۔ مسلم لیگ اس کام کو آسانی سے اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے چنانچہ اس باب میں مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خانصاحب نے ہدایات بھی جاری فرمائی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مختلف شہروں اور قصبوں بلکہ دیہات میں بھی مسلم لیگ کی متعلقہ شاخیں معاملہ پیش نظر کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے پوری کوشش اس باب میں صرف کر دیں گی کہ مردم شماری کے اندراجات نہایت صحت کیساتھ تکمیل تک پہنچیں۔ ارکانِ مسلم لیگ کے علاوہ ہم جماعت خاکساران سے بھی گذارش کریں گے۔ کہ وہ اپنی روایتی مستعدی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کر دیں۔ یہ ایک بہت بڑی "خدمتِ خلق" ہوگی۔ کیونکہ موجودہ نظام کے ماتحت مردم شماری کے غلط اندراجات سے خلق خدا کو بہت سے نقصانات کا احتمال ہوتا ہے۔ مقدم ضرورت ہوگی کہ کوئی شمار کنندہ اکیلا نہ ہو ہر دو اقوام کے نمائندے اکٹھے اندراج کریں۔

لیکن جمہور مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ فریضہ صرف ارکانِ لیگ اور جماعت خاکسار پر ہی عائد ہوتا ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کو اپنی ذمہ داری خود محسوس کرنی چاہیئے۔ اُسے چاہیئے کہ اپنے محلہ کی مردم شماری کی صحت کا خود ذمہ لے اور شمار کنندگان کے ساتھ ہو کر پوری پوری تحقیق سے اندراج کرائے۔ مندرجہ ذیل اُمور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

۱۔ عرفی نام۔ مثلاً لولو۔ ننھو نہ لکھا جائے بلکہ پورا اسلامی نام لکھا جائے۔

۲۔ اگر قاعدہ کی رُو سے مستورات کا نام لکھانا بھی ضروری ہو تو اسمیں رواجی تکلف نہ برتا جائے۔ نام لکھا دینے میں کوئی حرج نہیں۔

۳۔ قوم کے خانہ میں صرف مسلمان لکھا جائے۔ اسی طرح ذات کے خانہ میں بھی صرف مسلمان مسلمان

کی اسلام کے سوا کوئی ذات نہیں ہوتی۔

۴۔ مذہب کے خانہ میں صرف اسلام لکھا جائے۔ اسلام کسی فرقہ بندی کی اجازت نہیں دیتا۔

۵۔ زبان کے خانہ میں اُردو لکھا جائے۔ ہندی، ہندوستانی یا مثلاً پنجابی نہ لکھا جائے۔ پنجابی نوشت و خواند کی زبان نہیں۔ البتہ جو لوگ اُردو نہ جانتے ہوں وہ اپنی مادری زبان لکھائیں۔

۶۔ گھر کے تمام متعلقین اور ملازمین وغیرہ کے نام پہلے ہی ایک کاغذ پر لکھ لینے چاہئیں۔ ہم نے وہ لوگ بھی دیکھے ہیں جنھیں وقت پر اپنے بچوں تک کے نام یاد نہیں آیا کرتے۔

اگر کسی مقام پر کسی طرف سے مردم شماری کے ضمن میں کوئی مزاحمت یا دقت پیش کیجائے تو اس کی اطلاع اپنی قریب ترین مسلم لیگ کی شاخ اور اسلامی اخبارات کو فرداً فرداً دینی چاہیئے۔

(آخر میں اس بات کو پھر سُن لیجئے کہ مسلمان جب صحیح معنوں میں مسلمان ہوگا تو اس کے نزدیک عددی کثرت و قلت کوئی شے نہیں ہوگی۔ اس وقت تو ایک ایک مسلمان دس دس پر بھاری ہوگا۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے درمیانی ادوار میں، جہاں ابھی آدمی تولے نہیں جاتے۔ گنے جاتے ہیں۔ تعداد کی صحت نہایت ضروری ہے۔ یوں بھی مسلم شماری کسی قسم کا گناہ نہیں۔ اسکی سند تو خود عہدِ رسالت مآب میں بھی ملتی ہے۔ اور قوم کی بہت سی ضروریات کا علم ان اعداد و شمار سے ہوجاتا ہے۔ اس لئے اسمیں جد و جہد اور تعاون قوم کی خدمت ہے۔)

---

(۲)

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ :-

"تم لوگ شخصیت پرستی کے اس قدر خلاف ہو اور خود اپنی حالت یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال اور مسٹر جناح کی گویا پرستش کرتے ہو۔ اس قول و عمل میں کیا مطابقت ہے؟"

چونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ خیال اور حضرات کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہو اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ

کہ اس کا جواب طلوعِ اسلام کے صفحات پر ہی دیا جائے۔ یوں بھی۔ سوال اہم ہے۔ اس لئے ہماری فرمداری کا تقاضا ہے کہ اپنی پوزیشن کو واضح کریں

اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے دیکھنا چاہئے کہ "شخصیت پرستی" سے کیا مراد ہے ؟ ہمارے نزدیک شخصیت پرستی یہ ہے کہ کسی انسان کے کسی قول کو بلا سند کے مان لیا جائے۔ اور یقینی سند ہمارے نزدیک قرآن کریم ہے۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ جھوٹ مت بولو۔ ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس قول کی متابعت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ زید کا قول ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس قول کی سند قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ اس کے برعکس عمر کہتا ہے کہ قمار بازی میں کوئی عیب نہیں۔ ہم اس کے اس قول کو فوراً ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ عمر کا قول ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ ہے ماننا اور نہ ماننا۔ پھر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ زید کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے صحیح تسلیم کر لیا جائے اور عمر کی ہر بات کو بلا سوچے سمجھے رد کر دیا جائے۔ مانا اُسے جائے جو اسلامی معیار پر پورا اترے۔ اور انکار اس سے کیا جائے جس کی سند بارگاہِ قرآنی سے نہ ملتی ہو۔ یہ ہے ہمارا مسلک شخصیت پرستی کے متعلق۔ ہم اس شخصیت پرستی کے خلاف ہیں جس میں انسانوں کے اقوال و اعمال کو اپنی عقیدت و ارادت کی بنا پر صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ صحت کی سند بھی بارگاہِ قرآنی سے ملتی ہے یا نہیں۔

ہم حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے پیامِ حیات بخش کی نشر و اشاعت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم اپنے فہم و تدبر کے مطابق قرآن کریم کے مطالعہ سے علیٰ وجہ البصیرت جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہی ہے کہ حضرت علامہؒ اس دور میں سیاستِ قرآنی کے بلا ریب امام تھے۔ انھوں نے اپنی فراستِ ایمانی کی روشنی میں قوم کے امیال و عواطف اور احوال و کوائف پر ایک گہری تنقیدی نگاہ ڈالی۔ ان کے اسبابِ زوال کا بغور جائزہ لیا۔ اور اس کے بعد اس کے لئے قرآن کریم کے بیت الحکمت والشفاء سے ایک ایسا جان بخش نسخہ لائے جو ان کی موت کو زندگی، ضعف کو قوت اور زوال کو عروج میں بدل دے۔ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جسے ایک ایک مریض تک ہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وہ نورِ بصیرت ہے جسے عام کرنے کے لئے ہم بدل و جان ساعی ہیں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ ہم نے حضرت علامہؒ کی تعلیم و پیام کو

آنکھیں بند کرکے محض عقیدت و ارادت کی بنا پر صحیح تسلیم نہیں کرلیا۔ بلکہ از خود آزادانہ طور پر قرآنی روشنی میں اسکا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آج صحیح اسلامی سیاست کا علمبردار انھی کا پیغام ہے۔ ہماری نشأۃِ ثانیہ اسکی روشنی میں حاصل ہوسکتی ہے اور یہی چیز ہماری عقیدت کا باعث ہوئی ہے۔ یعنی یہ عقیدت بھی علی وجہ البصیرت ہے۔ اندھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس تین سال کے عرصہ میں ہم نے جو کچھ کیا ہے اسکی تائید میں ہر مقام پر قرآنی سند پیش کی ہے۔ اور ہم اللہ کے فضل و کرم کے بھروسے پر نہایت بلند آہنگی سے آج بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علامہؒ کا جو پیام ہمنے پیش کیا ہے جس کا جی چاہے مطالعہ کرے۔ ہم اسکی تائید میں قرآنی سند پیش کریں گے اس کے ساتھ ہی ہم بلا ادنیٰ تامل اور تذبذب اس حقیقت کا بھی اظہار کئے دیتے ہیں کہ حضرت علامہ کو ہم (معاذ اللہ) نہ نبی مانتے ہیں نہ رسول کہ انھیں منزہ عن الخطا اور معصوم سمجھنے لگ جائیں۔ ان کا کوئی قول جو قرآن کریم سے ٹکراتا ہو۔ یقیناً اس قابل ہے کہ اُسے فوراً ٹھکرا دیا جائے۔ یہ ہے ہمارا مسلک جس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ آپ ہم سے متفق ہونگے کہ اسے "شخصیت پرستی" کبھی نہیں کہا جائے گا۔ ہم ابھی تک حضرت علامہؒ کے پیغام کو مجملاً پیش کرسکے ہیں۔ ان کی تعلیم کی تمام جزئیات کو سامنے نہیں لاسکے۔ وہ رواجی اور پیدائشی مسلمان کو قرآنی مسلمان یعنی صحیح مردِ مومن بنانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انھوں نے پورا نظامِ تعلیم و تربیت قرآن کریم سے اخذ کرکے اپنے پیغام میں پیش کر دیا ہے۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ رفتہ رفتہ بتدریج جوں جوں یہ "رواجی مسلمان" اس کے قابل ہوتے جائیں اس پیغام کی مختلف ٹکڑیوں کو قرآن کریم کی سندات کے ساتھ لاتے جائیں۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ حضرت علامہ کا پیغام۔

چراغِ راہ ہے۔ منزل نہیں ہے۔

وہ ہمیں ان چراغوں کی روشنی میں قرآن کریم تک ہی پہنچاتے ہیں۔ انہی میں گم ہو جانے کی تلقین نہیں کرتے انھوں نے چونکہ ایک مدت العمر کے گہرے مطالعہ کے بعد حالاتِ حاضرہ کے رجحانات و نظریات کو سامنے رکھ کر ہمارے لئے قرآنی تعلیم کا خاکہ مرتب فرمایا جائے۔ اس لئے ہمارے نزدیک فراستِ قرآنی کی روشنی میں قرآن تک پہنچنا آسان ہوگیا ہے۔ یہ ہے حضرت علامہ کے پیام سے ہماری وجہِ عقیدت

حضرت علامہ حالات حاضرہ کے پیش نظر قرآنی بصیرت کے ماتحت ملّت اسلامیہ ہندیہ کے لئے جو نصب العین متعین فرما گئے تھے مسٹر جناح اس نصب العین کے حصول کی آئینی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ اس لئے ہم ان کے مسلک کی تائید ضروری سمجھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کو بھی معلوم نہ ہو کہ جس نصب العین کی طرف وہ قوم کو لئے جا رہے ہیں۔ اسکی قرآنی سند کیا ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے خوب پہچان لیا تھا کہ حضرت علامہ اقبال قوم کے لئے وہی راستہ متعین کریں گے جسکی طرف ان کی قرآنی بصیرت راہ نمائی کریگی۔ اس لئے انھوں نے انھی کے متعین فرمودہ راستہ کو اختیار کیا اور منزل بہ منزل قدم بہ قدم قوم کو اس راستہ پر لے چلے۔ چنانچہ انھوں نے بھی آجتک۔ جو کچھ کہا ہے ہم نے اسکی تائید قرآنی سند کے ساتھ کی ہے اور جس دن انھوں نے کوئی ایسی بات کہدی۔ جو قرآن کریم سے ٹکراتی ہو سب سے پہلے مخالفت کی آواز ہماری جماعت سے اٹھیگی۔ ہمارا خیال ہے کہ ان معروضات کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ہم "اقبال اور جناح کی پرستش نہیں کرتے۔ بھلا جس اقبالؒ کے یہاں سے دنیا بھر کے انسانوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی تعلیم ملتی ہو وہاں خود اسکی پرستش کا جواز کیسے مل سکتا ہے۔ اور جو ادارہ دنیا بھر کی "شخصیت پرستی" کے طوق و سلاسل سے آزاد ہونیکی دعوت دیتا ہو۔ . . . وہ خود اس قسم کی شخصیت پرستی کی لعنت میں کیوں گرفتار ہوگا۔

معارف القرآن

کے متعلق اس امر کی صراحت کر دی گئی تھی کہ اس کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ اور اس بارے کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا تھا کہ ہمارے ہندوستانی طریق طباعت میں ایک کتاب کو کتابت سے تکمیل تک کتنے مراحل میں سے گذرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ بایں ہمہ، اکثر احباب نے اپنے خطوط میں ارشاد فرمایا کہ معارف القرآن کا نسخہ جلد بھیجدیا جائے۔ اور چونکہ ان کے اس ارشاد کی تعمیل نہ ہوئی۔ اسکے بعد یاددہانی کے خطوط بھی آنے شروع ہو گئے۔ بدیں وجہ اس اعلان کی دوبارہ ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ اس کتاب کی کتابت جاری ہے۔ وقت بچانے کی خاطر ایک کے بجائے دو کاتب مصروف کار ہیں۔ بایں ہمہ اسکی تکمیل میں وقت لگیگا۔ جو ناگزیر ہے۔ لہذا اسکے لئے انتظار کرنا ہی پڑیگا۔

عاشقی صبر طلب۔ اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

دُعا

[یہ اشعار میں نے ۱۹۳۴ء میں لکھے تھے لیکن ابھی کہیں شائع نہیں ہوئے تھے کہ ۱۹۳۶ء میں حضرت علامہ اقبالؒ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "ضربِ کلیم" طبع ہو کر سامنے آئی اس میں دُعا کے موضوع پر چند شعر دیکھے جنہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا حضرت علامہ نے میرے ہی ان خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر جواب دیا ہے اور دُعا کے متعلق میرے نقطۂ نگاہ کی اصلاح کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ میرے شعر اُن کی نظر سے گذرے ہی نہ تھے۔

علاوہ ازیں ایک عجیب اتفاق یہ بھی ہے کہ میں نے یہ اشعار اپنے مرحوم بیٹے امجد کی ولادت سے تین مہینے بعد لکھے تھے۔ اور معلوم نہیں کہ کس کیفیت کے زیرِ اثر لکھ ڈالے کیونکہ بظاہر اُس وقت ان احساسات کی کوئی وجہ موجود نہ تھی لیکن اب امجد کے انتقال کے بعد ان اشعار کو پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اشعار اسی موقع کے لیے لکھے گئے تھے۔ م سَل]

اے دل تُو ہی بتا کہ میں مانگوں خدا سے کیا
ہوتا ہی ہے جہاں میں ہماری رضا سے کیا

ہے زیست اپنے بس میں نہ موت اختیار میں
مطلب ہمیں پھر اپنی فنا و بقا سے کیا

طوفاں کا زور شور ہے، دریا ہے موجزن
آب و ہوا کو آرزوئے نا خدا سے کیا

وقتِ معینہ پہ خزاں آئے گی ضرور
ہوتا ہے عندلیب کے شورِ نوا سے کیا

اسکے سوا کہ دل کا نکل جائے کچھ بخار
ہوتا ہے غم نصیب کی آہ و بکا سے کیا

جو حلقۂ کمانِ قضا سے نکل چکا
رُک جائے گا وہ تیر مری التجا سے کیا

وہ بھی تو اپنے کام میں مجبورِ محض ہیں!
شکوہ کروں میں کارکنانِ قضا سے کیا

ہر بات سے وہ قادرِ مطلق ہے بے نیاز
اُسکو بھلا غرض ہے مرے مدّعا سے کیا

اُٹھتے ہیں خود بخود مرے دستِ دُعا اسدؔ
ہر چند سوچتا ہوں کہ ہو گا دُعا سے کیا !
(اسدؔ مُلتانی)

تری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی ! مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے
وہی شراب وہی ہائے و ہُو رہے باقی طریقِ ساقی و رسمِ کدو بدل جائے
تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پُوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے
(علامہ اقبالؒ)

[شاعری کی دُنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ جناب اسدؔ فطرتاً متفاؤل (OPTIMIST) واقعہ ہوئے ہیں۔ اور ان کا کلام زندہ آرزوؤں کا پیامبر۔ خیال فرمائیے کہ ایسے شخص کے گھر میں امجد مرحوم جیسا لڑکا پیدا ہو تو گھر بھر کس طرح مسرت کے قہقہوں سے گلفشاں ہو جائے گا۔ بہجت و شادمانی کے اس ماحول میں ایسے شاعر کے قلب سے جس قسم کے جذبات کا اظہار ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے۔ لیکن اس وقت یہ ایسی نظم لکھتے ہیں جو درحقیقت بیٹے کا مرثیہ ہے؟ کیا فطرت کی غیر محسوس آواز نے چھ برس پیشتر ہی غیر شعوری طور پر اس کی اطلاع دیدی تھی۔ !!

اور پھر تصورات کی ہم آہنگی دیکھئے کہ حضرت علامہ اقبالؒ اپنی نظم کو اس انداز میں لکھتے ہیں گویا اسدؔ صاحب کی نظم کے جواب میں دُعا کے حقیقی فلسفہ کی تدریس و تفہیم ہے۔ حضرت علامہؒ کے نظم کی ابتدا اس انداز سے ہوتی ہے گویا یہ کسی کے استفسار کے جواب میں ہے۔ واقعی شاعر کی دُنیا عجیب ہوتی ہے۔ طلوع اسلام)

پاپولر

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز)

ہر زمانہ میں، ہر ایک سوسائٹی میں، عام طور پر کچھ الفاظ ایسے مروج و متداول ہوتے ہیں جن کا اطلاق بالعموم اس سوسائٹی کے اعلیٰ ترین اخلاق و محاسن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ان کا انتساب شخص متعلقہ کے مکارم اخلاق کے معراج کمال کی دلیل یعنی وہ الفاظ ایسے مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) ہوتے ہیں کہ ان سے اجتماعی و انفرادی نبض اخلاق کا صحیح صحیح درجہ معلوم ہو جاتا ہے۔ بھلے دنوں میں، اسلامی سوسائٹی میں، امین۔ صدیق۔ مجاہد۔ مومن متقی۔ متشرع۔ پرہیزگار۔ متدین۔ دیانتدار۔ اور ایسے ہی بہت سے الفاظ مروج تھے کہ ادھر متکلم کی زبان سے ادا ہوئے اور ادھر مخاطب کے ذہن میں ان کے منسوب الیہ کی سچی سچی تصویر مرتسم ہو گئی۔ مگر آج ہماری اینگلو مسلم[1] سوسائٹی میں یہ الفاظ تو قدامت پسندی، دقیانوسیت۔ ملائیت پر محمول کئے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی جگہ ایک جامع لفظ مغربی ٹکسال سے لیا گیا ہے جس کا انتساب ہزار عزت و افتخار کا موجب اور جملہ اخلاق جمیلہ کا ماحصل ہوتا ہے یعنی جس کسی کی انتہائی تعریف مقصود ہو۔ اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ بہت پاپولر ہے۔ یہ وہ اعزاز ہے جس کا حصول آج عین مقصد حیات قرار پا رہا ہے۔ اور جس کے لئے ہر قربانی "جہاد فی سبیل اللہ" کا درجہ رکھتی ہے۔ یوں تو اس کے معنی محض "ہر دلعزیز" ہیں لیکن روشن خیال طبقہ کی اس ہر دلعزیزی کے عناصر ترکیبی، اس ہر دلعزیزی سے کہیں مختلف ہیں جو کبھی قدامت پسندوں کے "دور جہالت" میں رائج تھے۔

مثلاً کسی صاحب سے آپ کو اس قدر دلی نفرت ہے کہ آپ اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں کہیں تنہائی میں اس کا خیال آ جاتا ہے تو اس کی تخریب و تذلیل کے لئے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے۔ اس کی عادات و خصائل، رنگ ڈھنگ، انداز و اطوار، غرض اس کی ہر ادا آپ کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہے

---

[1] ۔ اس سے مراد وہ تہذیب جدید ہے جو اسلامی جسد اور مغربی روح کے امتزاج و ائتلاف سے پیدا کیجا رہی ہے

دہی شخص راہ چلتے اتفاقیہ سامنے آجاتا ہے توخوشی سے آپ کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ دور سے ہی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھ جاتا ہے ؛"ہیلو مسٹر" کی غلغلہ انداز آواز فضا میں مسرت خیز لہریں پیدا کر دیتی ہے ہاتھ اس کشش وجاذبیت سے ملایا جاتا ہے کہ "سوز محبت" "گھنٹوں" تک مغز استخواں میں حرارت پیدا کئے رکھتا ہے۔ بڑے تپاک کی باتیں۔ بڑی محبت کی گفتگو۔ کہیں نہ ملنے کے گلہائے دراز کہیں تغافلِ بیجا کی شکایت ہائے رنگیں۔ کبھی اظہارِ مسرت کہ امتحاں میں بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی کبھی ایمائے تاسف کہ محنتِ شاقہ سے صحت پہ برا اثر پڑا ہے۔ عودِ صحت کے لئے دوا آمین آئیندہ ترقیوں کے لئے دعائیں۔ تبریک وتہنیت کا خط نہ لکھ سکنے کی معذرت محفل احباب میں شرکت کی دعوت۔ بغرض کہ غالب مرحوم نے جہاں "تمام دعائیں صرفِ دربان" کر دی تھیں۔ آپ نے بھی "تمام ادائیں صرف مہربان" کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اور قلتِ وقت کے عذر اور آیندہ سلسلۂ ملاقات جاری رکھنے کے وعدہ وعید اور اصرار وتکرار پر رخصت ہوئے اس نے ادہر منہ موڑا اور ادہر یاران نکتہ داں میں ایک قہقہہ بلند ہوا کہ یار خوب بنایا۔ کہنے لگے کہ میاں پاپولر ہونے کی اسکیم اسی طرح کامیاب ہوا کرتی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات سمجھ لیجئے کہ یہ صاحب ایک نہ ایک دن پاپولر ہو کے رہیں گے۔

یا مثلاً آپ کہیں باہر جانے کی تیاری میں ہیں کہ ادہر سے نوکر ایک ملاقاتی کارڈ ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کارڈ دیکھ کر سب سے پہلے آپ کا ہاتھ ماتھے پر جاتا ہے اور سب سے پہلا سوال نوکر سے یہ ہوتا ہے کہ "تم نے کیا جواب دیا ہے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ صاحب گھر میں ہی ہیں" اگر ملازم کہیں نیا نیا ہی آیا ہے یا ملنے والے صاحب "گھر کے بھیدی" واقع ہوئے ہیں تو یہ اطلاع ان تک پہنچ چکی ہوتی ہے کہ صاحب گھر میں ہی ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں نوکر پر جو قیامت ٹوٹنے والی ہے اس کا وقت ذرا ٹھہر کر آئے گا سب سے پہلے ملاقات کے کمرے میں تشریف لائے۔ آدھا جلا ہوا سگار پھر سے جلایا تا کہ ظاہر ہو کہ ایک عرصے سے یہیں بیٹھے ہیں) حکیم این سٹائن کے نظریہ اضافیت کی کتاب سامنے رکھ لی اور جذب وانہماک کی انتہائی گہرائیوں میں آواز دی کہ ہاں بلاؤ۔

"آہا آپ کدہر نکل آئے! ارے میاں اب تم ہم لوگوں سے ملتے ہو بھلا۔ سپرنٹنڈنٹ ہاتھوں میں۔ افسر خوش اور اب چاہیئے کیا" معراج زندگی ملاحظہ ہو)۔

"مسٹر جوزف[1] (یہ اس محمد یوسف کا تفریح ہے جوان کے والد بزرگوار نے اسلام سے کچھ نسبت پیدا کرنے کے لئے نام رکھا تھا) لوگوں کے ساتھ تعلقات خواہ کسی نوعیت کے ہوں لیکن جو قلبی واسطہ تمہارے ساتھ ہے وہ کبھی کم ہو سکتا ہے' ہاں تو میں کیا تمہاری مصروفیتوں میں ہارج تو نہیں ہوا؟"

"شکریہ نہیں بھائی صبح سے بیٹھا بیٹھا اکتا گیا تھا۔ جی میں ہی تھا کہ کوئی ادھر آ نکلے تو تنہائی رفع ہو۔ تم تو پیغام رحمت ہو۔ اور ہاں یار چائے پیو گے" (حالانکہ دس ہی منٹ پیشتر انہیں خود چائے مانگنے پر جواب ملا تھا۔ کہ گھر میں دودھ نہیں)

"نہیں تکلف کی ضرورت نہیں۔ اپنا گھر ہے میں ابھی ابھی چائے پی کر آ رہا ہوں" (خواہ صبح سے مارے مارے پھر رہے ہوں اور پیٹ میں چوہے ناچ رہے ہوں) "اور ہاں ان صاحب سے ملئے میرے عزیز ترین دوست مسٹر اے۔ کے۔ ناز"

"آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی"۔ (یعنی جس کے متعلق نہ کچھ جانتے ہیں نہ بوجھتے ہیں اور دونوں نووارد وبال جان ہو رہے ہیں۔ اس سے مل کر بے حد خوشی ہوئی)۔

"بھائی تم سے تصنع برتنے کی کیا ضرورت۔ اس وقت آنے سے غرض یہ ہے کہ مسٹر ناز ... سوسائٹی کی سکرٹری شپ کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہو رہے ہیں۔ آپ اس کے ممبر ہیں آپ کا ووٹ چاہیئے اور میں بیسکر جاؤں گا"

یہ کہے جا رہے ہیں (اور بالکل غلط) کہ صاحب میں نے ابھی صبح ہی مسٹر..... سے وعدہ کر لیا ہے آپ پہلے ہی تشریف لے آتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ادھر سے اصرار پر اصرار چلا جا رہا ہے اور ان کی بھی مروت کا تقاضا ہے کہ "روکھا جواب" نہ دیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اچھا صاحب میں آپ کو ہی ووٹ دوں گا مطمئن رہیئے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ ان حضرت سے بہتر اور کوئی شخص اس عہدہ کے لئے موزوں نہیں تو صبح کا زبردستی وعدہ لیا ہوا اس کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتا ہے"

---

[1] اس تمام مضمون میں روئے سخن کسی خاص شخص کی جانب نہیں بلکہ عام حالت کا بیان مقصود ہے۔ پرویز

مزید توثیق و تصدیق کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ صاحب بھولنا نہیں۔ اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی ذرا انکا پروپیگنڈا کرنا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے گردن ہلا دی۔

شام کے وقت فریق مخالف کے صاحب آن دھمکے اور اسی اصرار و تکرار، عذر و معذرت کے اعادہ کے بعد ان سے بھی وعدہ کر لیا کہ اچھا صاحب ووٹ آپ کا۔

"تاریخ انتخاب کی صبح سے ہی جو آپ غائب ہوئے ہیں رات تک واپس نہیں آئے۔ دوسرے دن ناکام امیدوار سے معذرت چاہی کہ "اچانک ایک دوست کا ٹیلی گرام آ گیا جس کی وجہ سے مجھے باہر جانا پڑ گیا۔ میں نے تو کوشش بہت کی لیکن خیر پھر سہی" کامیاب امیدوار سے جوش مسرت میں معذرت کی بھی ضرورت نہ سمجھی، کہ ممکن ہے اسے یاد ہی نہ ہو کہ یہ آئے بھی تھے یا نہیں اور کہہ دیا کہ استاد میں ووٹ میرے فراہم کردہ تھے۔

سمجھ لیجئے کہ ایک دن یہ صاحب یقیناً تمام سوسائٹی میں پاپولر ہوں گے۔

یا مثلاً کھانے کے میز پر احباب کا جمگھٹا ہے۔ مختلف مذاہب (بہ اعتبار پیدائش) کے لوگ بیٹھے ہیں مذہب نے نوع انسانی کو جس "ذلت و خواری" کی پستیوں میں ڈھکیل رکھا ہے اس کے خلاف اظہار نفرت کیا جا رہا ہے۔ اب آپ کے پاپولر ہونے کی اسکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیے۔ چنانچہ "ملّا ازم" کے متشابہات سے خدا اور رسول کے محکمات تک سب کے سب اس استہزاء و تمسخر کی لپیٹ میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ قہقہوں پر قہقہے اڑ رہے ہیں اور ان کے ساتھ ہی تمام "پارینہ خیالات" کی دھجیاں فضا میں اڑتی جاتی ہیں۔

اس حریت فکر اور آزادی خیال کا ہیرو بھی ایک نہ ایک دن پاپولر ہو کر رہے گا۔

یا مثلاً ایک واقعہ کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ کوئی غلط کہتا ہے کوئی صحیح۔ آپ کو اس کا حتمی طور پر علم ہے لیکن چونکہ اس یقینی علم کے اظہار سے کسی نہ کسی کی تغلیط ضروری ہے اس لئے ہر دلعزیزی کی سکیم کا تقاضا ہے کہ حقیقت پوشی سے کام لیں جب آپ سے پوچھا بھی جائے تو صاف کہہ دیں کہ "نا بھئی مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں

یہی نہیں آپ کے سامنے ایک حق دار کا حق دوسرا شخص غصب کئے جا رہا ہے یعنی شہادت آپ کی ہی ہے آپ سے پوچھا جاتا ہے، پاپولر ہونے کی اسکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ کہدیں کہ نہیں صاحب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اصل واقعہ کیا تھا میں اخبار بینی میں ایسا محو تھا کہ کچھ سنا ہی نہیں۔

یا یہ کہ کسی کی غیبت میں اس کی ذات کے خلاف بدترین اتہام لگائے جائیں لیکن جب اس کے سامنے ذکر آئے تو صاف صاف مکر جائیں۔ اس سے آپ تو معتبر کے معتبر رہیں گے اور آپ کے بیان کے شاہد خود بخود دروغ باف اور فتنہ پرداز قرار پا جائیں گے۔

یا مثلاً ایک شخص کے متعلق آپ کو خوب علم ہے کہ بیحد متقی بڑا بد فطرت۔ دروغ گو حاسد اور خود پسند ہے خوشامد پسندوں کے طفیل پبلک کی کوئی امانت اس کے سپرد کئے جانے کی تجویز ہے جس کا وہ ہرگز ہرگز اہل نہیں۔ وہ از راہ کسر نفسی (جسے فی الحقیقت کبر نفسی کہنا چاہیئے) کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب میں تو اس کا اہل نہیں ہوں پاپولر ہونے کی سکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ فوراً پکار اٹھیں "کہ واہ صاحب۔ اس قدر کسر نفسی۔ خدا کی قسم اس قحط الرجال میں آپ کا وجود گرامی ہمارے لئے از بس مغتنم ہے۔ آپ کو کیا علم کہ آپ کس قدر مبارک ہستی ہیں بھائی! اپنے لئے نہیں تو محض خدا کا کام سمجھ کر اسے سنبھالئے۔ آپ سے زیادہ اس کا کوئی اور اہل نہیں"۔

یا کوئی صاحب گپ ہانک رہے ہیں۔ ہر دلعزیز بننے کی اسکیم کا تقاضا ہے کہ اسے ٹوکئے نہیں لوگوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ تنہائی میں بھی اسے اس کی کذب بیانی یا کسی ایسے ہی اور عیب پر متنبہ نہ کیجئے۔ کیونکہ اس سے وہ برا مانے گا۔ اور آپ پاپولر نہیں رہ سکیں گے۔

غرض کہ یہ چند اصول ہیں جن پر کاربند ہونے سے پاپولر ہونے کی سکیم کا کامیاب ہونا یقینی ہے ان کے علاوہ بہت سے فروع بھی ہیں۔ جن کی تفصیل طول طویل ہوگی منجملہ ان کے اپنی تنخواہ کو اصل سے ہمیشہ تین گنا بتانا۔ اپنے آباؤ اجداد کو کسی نہ کسی نواب صاحب کے خاندان سے منسوب کرنا۔ بڑے بڑے افسران اور ارباب حل و عقد سے اپنے تعلقات جتانا۔ ہر ایک سے کہدینا کہ "ہاں ہیں یہ کام کرادوں گا۔ میں فلاں صاحب سے کہدوں گا۔" یہ بھی ضروری ہے کہ بیوی کا (اگر وہ پردہ میں ہے تو) خواہ پاجامہ پھٹ رہا ہو مگر صاحب کی پتلون کی سلوٹ نہ خراب ہو جائے۔ بچے کے لکھنے کی تختی نہ آئے لیکن ٹینس کا ریکٹ ضرور والد ماجد کی

بغل میں ہونا چاہیئے کہ اس سے کسی بڑے آدمی کے ٹینس کورٹ تک رسائی ہوسکتی ہے۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں خواہ آٹا ادہار لے کر کھانا پڑے لیکن سینما میں کبھی ناغہ نہو۔ بیوی بچے خواہ گھر کے اندر باسی روٹیوں پر گذران کر رہے ہوں لیکن آپ کے ٹفن میں (جو لوگوں کے سامنے جائے) مرغ مسلم نہیں تو کم از کم مرغ پلاؤ تو ضرور ہو۔ علاوہ بریں مہینے میں ایک آدھ دعوت بھی ضرور دیں اور کھانے والے یہ کہکر کھا جائیں کہ خوب الّو بنایا (اور اس کا آپ کو خوب علم ہو۔ کیونکہ جب آپ کسی کے ہاں کھانے پر گئے تھے تو یہی فقرہ آپ کی طرف سے اس میزبان کی شان میں غائبانہ ارشاد ہوا تھا)۔

مختصراً یہ کہ اصول ہوں یا فروع نقطہ یہ پیش نظر رہے کہ جو کچھ آپ ہیں وہ ظاہر نہ ہونے پائیں۔ اور جو ظاہر ہوں وہ حقیقت نہو۔ جو محسوس کریں وہ کہیں نہیں اور جو کہیں وہ محسوس نہ کر رہے ہوں۔ قلب اور زبان میں ہم آہنگی کبھی نہ ہو اور اس روش کا نام پالیٹکس یا مصلحت رکھ لیں۔ بس پاپولر ہونے کی اسکیم کا کامیاب ہونا یقینی۔ اور یہ آخری ڈگری ہے جو آج اخلاقی یونیورسٹی سے آپ کو مل سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ محض نام بدل دینے سے حقائق نہیں بدل جایا کرتے تو آیئے دیکھیں کہ قرآن کے دفتر سے اس اعزاز عظمیٰ کو کیا سند ملتی ہے قرآن کریم نے قول و فعل، ظاہر و باطن، قلب و زبان کی یکسانیت و ہم آہنگی کو ایک مسلم کا معیار خصوصی قرار دیا ہے اور قول و فعل میں مغائرت اس کے نزدیک سب سے بری چیز ہے ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ (۶۱:۱)

اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک یہ بہت ناپسندیدہ ہے کہ تمہارا قول و فعل یکساں نہو۔

اور منافقین کے متعلق فرمایا کہ۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ۔ (۳۔ ۱۷)

وہ زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی اور اللہ خوب جانتا ہے جس چیز کو وہ دل میں چھپاتے ہیں۔

گویا اسلام اور حق و صدق مرادف الفاظ ہیں۔ استیعاب مقصود نہیں ورنہ تمام قرآن ان امثال و نظائر سے بھرا پڑا ہے جن میں اس ایمان و اقرار کی قطعاً کوئی قیمت نہیں رکھی گئی جو حلق سے نیچے اتر کر قلب کے عمیق گوشوں میں جاگزیں نہ ہو۔

اعلاء کلمۃ الحق کی اہمیت کے اظہار اور کتمانِ حقیقت کے خلاف کس قدر بین الفاظ میں ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ ..... فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴:۲)

اے ایمان والو! تم انصاف پر قائم رہو اور خدا کی طرف سے (ہمیشہ) حق کے شاہد رہو خواہ یہ گواہی خود تمہارے اپنے نفس کے خلاف۔ یا والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وہ شخص (جس کے خلاف حق کی شہادت دینی پڑے) خواہ امیر ہو خواہ غریب۔ اللہ کو ان کے ساتھ یکساں تعلق ہے۔ سو تم خواہش نفس کی اتباع نہ کرو کہ (کہیں تم) حق و انصاف سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے"

ان بین احکام کی موجودگی میں قرآن کو قرآن جاننے والے کے لئے کہاں گنجائش رہتی ہے کہ ایک واقعہ اس کے سامنے پیش ہو۔ اور وہ اس کے متعلق غلط بیانی کرے۔ یا حق گوئی سے اعراض کرے اور خاموش رہے وہ ایسے وقت میں اللہ کی بے نیام تلوار ہے جو ذاتی خواہشات اور رجحانات دنیوی کو بالائے طاق رکھکر حق و صداقت کے لئے بجلی کی طرح کوند پڑتی ہے خواہ اس کی زد خود اس کی اپنی گردن پر ہو۔ یا اپنے والدین یا عزیز و اقارب کی گردن پر امیر کی امارت اور غریب کی غربت اس کی حق گوئی کے راستہ میں مانع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ مخالفین میں سے کسی ایک پارٹی کی طرف سے بطور گواہ شہادت نہیں دے رہا ہے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ شُهَدَاءَ لِلَّهِ یعنی وہ اللہ کی طرف سے گواہ بنا ہے۔ اس لئے کسی پارٹی کا خیال اسے جادۂ حق و صداقت سے کس طرح منحرف کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شہادت سے محض وہ شہادت ہی مقصود نہیں جو عدالت کے کمرہ میں ہی دی جائے کیونکہ اس کی کہیں تخصیص نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں دنیا کے

کسی گوشہ میں جہاں کوئی واقعہ اس کے سامنے پیش ہو بہ حیثیت مسلم اس کا فرض ہے کہ حقیقت بیان کر دے اور نہ صرف یہ کہ کج بیانی سے ہی باز رہے بلکہ گواہی کے موقع پر خاموش رہنا بھی قرآن کے نزدیک قابلِ مواخذہ ہے۔ اگر خاموش نشینی گناہ است۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (۲ : ۱۶)

اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کے پاس خدا کی طرف سے کوئی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا دنیا بھر کے ٹھیکہ دار ہیں کہ لوگوں کو برائیوں سے روکتے پھریں[۵۱] اور ان کے اعمال حیات کا جائزہ لے کر احتساب کرتے رہیں۔ سو جو مسلمان ہیں وہ سن رکھیں کہ اوروں سے تو غرض نہیں مسلمان تو یقیناً دنیا بھر کے ٹھیکہ دار ہیں۔ ایک مسلم کی تخلیق کا مقصد اس کا امتیاز خصوصی ہی یہی ہے کہ وہ دنیا بھر میں جہاں کہیں برائی دیکھے اسے روکے اور اس کی جگہ بھلائی کا حکم دے۔ فرمایا کہ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳ : ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لئے نکالا گیا ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

المعروف اور المنکر پر الف۔ لام۔ استغراق کے لئے آیا ہے کہ بھلائی کی اشاعت اور برائی کی روک تھام میں کسی خاص نوعیت یا زمان و مکان کی تخصیص نہ ہو یعنی ایک مسلم اس شہنشاہ حقیقی کا سپاہی ہے۔ جو رب العالمین ہے اور اس کا فریضۂ حیات یہ ہے کہ جہاں تمرد و سرکشی دیکھے، اس کا احتساب کرے۔ جہاں کسی کو صراطِ مستقیم اور حق و صداقت سے ہٹا ہوا پائے فوراً اسے روک کر راہ راست پر لے آئے۔

---

۵۱ فریضہ احتساب اور امر بالمعروف مستقل عنوان ہیں جو بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز اس موضوع پر مستقل طور پر علیحدہ لکھا جائے گا سر دست ضمنی طور پر چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اور یہی وہ امتیاز ہے جس کی بدولت یہ خَیْرُ اُمَّۃ ہے اور یہ فریضہ بھی ہر مسلم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ فرض ہے۔

لیکن آہ ۔آں قدح بشکست وآں ساقی نماند ۔

آج مصلحت بینی اور اقتضائے وقت" کا زمانہ ہے پرانے وقتوں کی یہ باتیں کون سنتا ہے ۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب۔یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ خواہ مخواہ ساری دنیا کو دشمن بنا لیا جائے دل کو محبت کے لئے مخصوص کر دینا چاہیئے ہر اک سے پیار۔ ہر اک کی عزت ۔ انکسار۔ درگذر عفو چشم پوشی، تسامح۔پاس ولحاظ۔ مروت تحسین یہ وہ خوبیاں ہیں جو شرف انسانیت ہیں اور یہی اخلاق کا اعلیٰ ترین معیار۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور بیحد مرغوب نظر آتی ہے اور ان الفاظ میں وہ محبوبیت وجاذبیت ہے کہ ایک دفعہ تو انسان ضرور چکرا جاتا ہے کہ بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو سوائے لفظی طلسم کے اس وعظ کے اندر اور کچھ حقیقت نہیں ملتی ۔ سب سے پہلے تو معیار اخلاق کے ایسے مدعی سے خود اس کی زندگی کا تجربہ پوچھنا چاہیئے کہ جو وہ کہہ رہا ہے واقعی ہر موقع پر اس پر عمل بھی ہو سکتا ہے ؟ اس کے بعد ان مواعظ حسنہ کا خود تجزیہ کیجئے۔ تو نظر آئے گا کہ ان صفات میں سے ہر ایک صفت ایک وقت میں خود ایک عیب بن جاتی ہے، اور اس کی ضد اس کی جگہ صواب ہو جاتی ہے مثلاً عفو و درگذر بڑی اچھی چیز ہے لیکن کن لوگوں سے ؟ محض ان سے جو اپنے کئے پر پشیمان اور اپنی غلطیوں پر نادم ہوں۔ لیکن عفو و درگذر عادی مجرم سے کرتے جائیے ۔ دیکھئے دنیا کے نظام کا کیا حشر ہوتا ہے مظلوم سے محبت کے معنی یہی ہیں کہ ظالم سے نفرت کی جائے نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا۔ بدکردار سے مروت برتنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نیکو کار انسانوں پر دنیا تنگ کرتے جا رہے ہیں غضب وظلم کی تحسین کے یہ معنی ہیں کہ آپ دنیا سے عدل وانصاف کو برباد کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ عاجزی وشرافت بڑی خوبی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ غیرت وخودداری ہاتھ سے نہ جائے خاکساری اور انکساری بڑی نیکی ہے بشرطیکہ اس سے شریر ومتفنی شیاطین کے حوصلے نہ بڑھتے جائیں کسی بے کس کو پناہ دیجئے تو حسن اخلاق۔

لیکن کسی مفرور مجرم کو پناہ دیجئے تو آپ بھی برابر کے مجرم کسی معصوم و بے گناہ کے ایک چھڑی مار دیجئے تو دنیا اور آخرت میں مستوجب عقوبت لیکن بے گناہوں پر حملہ آور کے سینے میں سنگین گھونپ دیجئے تو بقائے دوام کا سہرا آپ کے سر قتل و خوں ریزی دنیا کے عظیم ترین گناہوں میں سے ہے لیکن جب کوئی مجسٹریٹ حقیقی قاتل کے خلاف فتویٔ موت صادر کرتا ہے تو منصف و عادل کا لقب پاتا ہے۔ غرض اس اصول کو جہاں تک پھیلاتے جائیے۔ نظر آتا جائے گا۔ کہ ایک محبت کے لئے۔ ایک بغض۔ ایک عفو کے لئے ایک انتقام۔ ایک کی مدد کے لئے دوسرے کی دشمنی۔ ایک تعمیر کے لئے ایک تخریب لازمی اور ضروری ہے جہاں محض انتقام و سخت گیری کوئی اخلاق نہیں وہاں محض عفو و درگذر بھی کوئی خوبی نہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ ان دونوں کی حدبندی اور ان کا جائز استعمال ہی عین اخلاق ہے اور یہی وہ حدبندی ہے جسے اسلام نے صراط مستقیم۔ جادۂ اعتدال اور دین فطرت قرار دیا ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کے لئے فرمایا ہے کہ۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے (اعمال کے) تم گواہ بنو اور تم پر رسول گواہ ہو

اب سوچئے کہ آپ کی اس مسامحت اور درگذر کا فلسفہ کہاں رہتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی قائم ہو جائے کہ جس کا ہر فرد یہ اپنا فرض سمجھے کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر بھی وہ اپنے ابنائے جنس کو متنبہ کر دیا کرے گا[۱]۔ تو بڑے بڑے جرم جو فی الحقیقت انہی چھوٹی چھوٹی ابتدائی غلطیوں کے آخری نتائج ہوتے ہیں، دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں لیکن جس سوسائٹی کے افراد سے احتساب کا احساس اٹھ جائے۔ غلط روی اس سوسائٹی کی گویا فطرت ثانیہ ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ عیب کو عیب شمار ہی نہیں کیا جاتا یہی حالت آج ہماری ہو چکی ہے[۲]۔

---

[۱] بشرطیکہ مقصد اس سے اصلاح اور خیر ہو نہ کہ دوسرے کی تحقیر و تذلیل۔ پرویز۔

[۲] کہا جاتا ہے کہ آجکل چونکہ کسی میں حق سننے کی تاب نہیں اس لئے حق گوئی کے لئے فضا سازگار نہیں ہے۔ لیکن یہی کمزوری ایمان ہے حق گوئی کا تو بہترین وقت وہی ہے جب باطل کا زور ہو۔ پرویز۔

ان مواقع کا تعین مشکل ہے کہ کہاں کہاں عفو و تسامح سے کام لینا چاہیئے اور کہاں کہاں انتقام و مؤاخذہ ضروری ہو جاتا ہے لیکن ایک چیز بالکل واضح ہے جسے بطور اصول کے پیش نظر رکھنا چاہیئے یعنی جہاں آپ کی اپنی ذات کا تعلق ہو۔ اور مجرم اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا رہا ہو وہاں آپ کو اختیار ہے۔ کہ نرم روی، عفو، درگذر، پاس و لحاظ سے کام لیں لیکن جہاں حق و باطل کا مقابلہ آپڑے وہاں ہر حال میں حق کی تائید اور باطل کی تردید آپ پر لازم آجائے گی۔ قرآن کریم نے عفو۔ درگذر۔ نرم روی۔ خوش خلقی حلم اور انکسار کو مومنین کی صفات قرار دیا ہے۔ خود جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۳:۱۷)

پس خدا کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم خو ہو گئے ورنہ اگر آپ تند خو۔ سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ پس ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے بخشش مانگئے

یہ موقع عام طور پر حسن و اخلاق۔ کشادہ روئی۔ صبر و تحمل کا تھا لیکن جب کفر و ایمان۔ حق و باطل صدق و کذب کے مقابلہ کا موقع آیا تو حکم ملا کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ان پر سختی کرو۔ اس لئے کہ مفسدین سے نرمی برتنا دنیا کو فساد اور شر کا گھر بنانا ہے۔ ان احکام کی تفسیر، ان نازک مواقع کا تعین، یہ باریک سی حد بندی ہمیں مخبر صادقؐ۔ قرآن ناطق کے نقوش قدم میں صاف اور بیّن طور پر ملتی ہے۔ اہل مکہ نے ہر ممکن اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جان تک لینے کے منصوبے باندھ لئے۔ کئی مرتبہ حضور سے صحابہؓ نے عرض بھی کیا کہ آپ ان کے لئے بد دعا ہی کیجئے۔ لیکن قربان جائیے اس رحمت دو عالمؐ کے عفو کریمانہ کے کہ اس نے ذاتی انتقام کے لئے بد دعا تک نہ کی لیکن ایسی بے کسی کے عالم میں اہل مکہ کا ایک وفد حضور کی خدمت میں آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ تسلیم کر لینے پر تیار ہیں اور جو کچھ چاہیں ہم مان لینے پر آمادہ ہیں لیکن ہمارے معبودوں کی تکذیب چھوڑ دیجئے۔ اور تو اور خود حضورؐ کے چچا ابو طالب تک نے کہہ دیا کہ "محمد کیا حرج ہے اگر ایسا کر لو" لیکن یہ حق و باطل کا مقابلہ تھا۔ اس مقام پر ان کا کوئی لالچ حضورؐ کو پھسلا نہ سکا نہ ان کی طرف سے آنے والے مصائب قدم میں لغزش پیدا کر سکے فرمایا۔

اور صاف صاف فرمایا کہ۔

لو جئتمونی بالشمس حتی تضع فی یدی ما سالتکم غیرھا (بخاری)

اگر تم میں ایسی قوت و طاقت پیدا ہو جائے کہ سورج کو آسمان پر سے اتار کر میری ہتھیلی پر رکھدو۔ جب بھی طلب حق کے سوا تم سے اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اور وہی کہوں گا جو کہہ رہا ہوں۔

اور خود قرآن نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کہ

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (۶۸ : ۱)

ان تکذیب کرنے والوں کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ (اپنے کام میں) کچھ ڈھیلے ہو جائیں۔ آپ اس کا کہنا کبھی نہ مانئے (جو بڑھ بڑھ کر) قسمیں کھا رہا ہے اور بے وقعت ہے

بظاہر ایسا وقت تھا کہ بہ تقاضائے مصلحت ان سے مداہنت برتی جاتی لیکن حضورؐ نے ایسا نہیں کیا اور اس طرز عمل پر حضورؐ کو قرآن کریم نے فرمایا وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (قلم) بیشک آپ خلق حسن کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔ حق و صداقت کے راستے میں روڑے اٹکانے والوں کے خلاف جان و مال سے جہاد کیا لیکن جب ان کفار پر آخری فتح حاصل کی۔ اور فاتح و منصور اس شہر میں داخل ہوئے جس کو چھوڑنے پر انہی دشمنوں کی شقاوت قلبی نے مجبور کر دیا تھا تو وہ تمام دشمن پابزنجیر سامنے کھڑے تھے۔ وقت تھا کہ عمر بھر کے مصائب کا آج بدلہ لیا جاتا لیکن یہ بدلہ ذاتی ہو جاتا فرمایا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ رحمت دو عالم کا یہی وہ خلق تھا جس کی وجہ سے تمام کے تمام پاؤں میں آ گرے غرض جہاں اپنی ذات کا معاملہ تھا اس عفو کریمانہ سے کام لیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکی لیکن جہاں حق و باطل کا مقابلہ آیا، ذرا نرمی نہ برتی۔

اسی اخلاقی جرأت کے مظاہرے ہمیں قرون اوّل کے مسلمانوں میں ملتے ہیں جنھوں نے شمع نبوت سے اکتساب ضیاء کیا تھا۔ حضرت عمرؓ (کہ جن کے سائے سے شیطان بھاگتا تھا) بھرے مجمع میں لوگوں سے پوچھتے ہیں۔ کہ

اگر میں جادۂ حق و صداقت سے انحراف کروں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو" ایک بدو اٹھ کر کہتا ہے۔ کہ "خدا کی قسم اس تلوار سے تمہارا سر اڑا دوں" وہ پرستار صداقت باغ باغ ہو جاتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ قوم میں اتنی جرأت ایمان موجود ہے۔ یہی نہیں بھرے مجمع میں حضرت عمرؓ کو (جو امیر المومنین تھے) ٹوک دیا جاتا ہے کہ ہمیں بتاؤ کہ یہ کرتا کہاں سے بنوایا؟ جب تک اطمینان بخش جواب نہیں ملتا آگے نہیں بڑھنے دیتے اللہ اللہ کس قدر جرات تھی ان کہنے والوں میں، اور کس قدر بلند حوصلگی اور وسعت ظرف تھی ان سننے والوں میں۔

اگرچہ جب خلافت بادشاہی میں بدلی تو درباری زندگی اور عجمی اثرات نے خوشامد پرستی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا لیکن پھر بھی ایمان کی یہ چنگاری اس میں اکثر اوقات شعلہ فشاں نظر آتی ہے۔ ہارون الرشید کے دربار میں ایک شاعر قصیدہ مدحیہ پڑھتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "اے خلیفہ اگر عمرؓ و علیؓ کے زمانہ میں آپ ہوتے تو خلافت پر کوئی جھگڑا ہی نہ پڑتا" (یعنی بلا اختلاف لوگ آپ کو خلیفہ منتخب کر لیتے) وہیں اہل دربار میں سے ایک مرد مومن اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ "کیوں غلط کہتے ہو۔ خلیفہ کے جد امجد حضرت عباسؓ اسوقت موجود تھے پھر جھگڑا کیوں نہ چک گیا" کچھ اندازہ فرمایا آپ نے اس جرأت ایمان کا؟ شخصی حکومت بھرا دربار لیکن حق و باطل کے مقابلہ میں کسی ڈرانے والے کا ڈر اسے باز نہ رکھ سکا۔ اور اعلائے کلمۃ الحق میں وہ رعب تھا کہ خلیفہ بھی سنکر مسکرا دیا۔ اور اسے کہنا پڑا کہ ٹھیک کہتے ہو۔

مامون الرشید کے عہد میں مسئلہ خلق قرآن نے جو قیامت برپا کر رکھی تھی۔ کس سے پوشیدہ ہے ایک صاحب ایمان (عبدالعزیز بن یحییٰ) اس جسارت و صداقت کو قلب میں لے کر مکہ سے روانہ ہوتے ہیں اور جامع بغداد میں جا کر علی الاعلان کہتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ ہرگز ہرگز مخلوق نہیں ہو سکتا حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس کہنے کا انجام کیا ہوگا۔

خوف طوالت مزید مثالیں پیش کرنے سے روک رہا ہے کتب تاریخ اٹھا کر دیکھئے اس جرأت ایمان کی کتنی ہی مثالیں آپ کے سامنے ہوں گی۔ یہ کیوں تھا اس لئے تھا کہ ان کے سامنے قرآن عظیم کی تعلیم اور حضورؐ نبی اکرم کا اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ حضورؐ نے فرمایا۔

من رای منکم منکرًا فلینکرہ بیدہ ومن لم یستطع فبلسانہ

ومن لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان (ترمذی شریف)

(او کما قال رسول اللہ ص) جو مسلمان کسی بُرائی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ کے زور سے مٹائے اگر اس کو استطاعت نہ ہو تو زبان سے بُرا کہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل ہی میں بُرا سمجھے مگر یہ سب سے کمزور ایمان ہے مگر قید استطاعت سے یہ مراد نہیں کہ آپ اپنی جرأت اخلاقی کو خود بخود کم کرتے جائیں اور عدم استطاعت کی آڑ میں ہر طرح کی منافقت پر اتر آئیں۔ بلکہ استطاعت کا موازنہ مقابلہ کی مجبوریوں سے ہوگا۔ قرآن کریم میں صرف ایک موقع ایسا ہے جہاں اتنی اجازت دی ہے کہ صرف جان بچانے کی خاطر اگر زبان سے کفر کا اقرار کر لیا جائے تو مباح ہے یعنی وہاں بھی صرف اجازت ہے۔ حکم نہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ بَعْدَ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۶:۱۴)

جو کوئی ایمان لانے کے بعد کفر کرے بجز اس کے کہ وہ مجبور ہی کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، مگر جو دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور بھاری عذاب ہے

لیکن آپ محض ہر دلعزیز ہونے خاطر، ممدوح خلائق بننے کے لئے لوگوں کی ملامت سے بچنے کے کارن منافقت اختیار کریں تو یاد رہے کہ قرآن کریم میں اس کے لئے بڑی سخت سرزنش آئی ہے۔ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ... وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۵:۸)

اے ایمان والو جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایک ایسی قوم لے آئے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور اللہ سے ان کو محبت ہوگی۔ (ان کے اوصاف یہ ہوں گے کہ) وہ ایمان لانے والوں کے آگے منکسر المزاج اور نہ ماننے والوں پر سخت گیر ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا (قطعاً) کوئی خوف ان کے دل میں نہ ہوگا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ عطا فرمائے اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔

گویا کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا۔ اور بلاخوف و خطر سچی بات کہدینا یہ خصوصیت ہے اس قوم کی جو اللہ کو محبوب ہے اور اس اخلاقی جرأت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت فرمایا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کے نزدیک سب سے پہلا محاسبہ خود اپنے اعمال و نفس کا ہے اس کا اعلان ہے۔ کہ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ (۲:۴۴)

(کیا غضب ہے کہ) لوگوں کو تو نیک کام کرنے کو کہتے ہو۔ اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔

اس کے نزدیک سب سے بڑی سرزنش اور سب سے سخت ملامت خود ضمیر انسانی کی ہے۔ یہی اس کا نامۂ اعمال ہے جو ہر وقت اس کے گلے کا ہار ہو کر لٹکتا رہتا ہے اور اسی کا احتساب سب سے زیادہ سخت گیر ہے۔

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ۝ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷:۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا نامۂ اعمال اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے جسے قیامت کے دن نکال کر اس کے سامنے پیش کردیں گے اور وہ اسے کھلا ہوا دیکھے گا۔ پھر کہا جائے گا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے آج خود تیرا نفس ہی تیرے لئے کافی محاسب ہے۔

لیکن بایں ہمہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ دوسرے شخص کو غلطی پر متنبہ وہی کرے جو خود کبھی غلطی نہ کرتا ہو گنہ گار کو اس کے گناہ کی تنبیہ وہی کرے جو خود معصوم ہو اس کے تو معنی یہ ہیں کہ احتساب اعمال صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تک ہی محدود رہے۔ حالانکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور اصلاح نفس دو جداگانہ مستقل احکام ہیں خود اپنے

نفس کا تزکیہ و اصلاح سب سے مقدم ہے لیکن جس مسلمان کو دوسرا مسلمان نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے اسے محتسب کے نامۂ اعمال کی تفتیش کرنے کے بجائے خود اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے نماز کے وقت آپ سو رہے ہوں اور دوسرا شخص اس کے لئے جگائے تو کیا آپ اس لئے اٹھنے سے انکار کردیں گے کہ جگانے والا خود پابند صلوٰۃ نہیں ہے؟ اس کے لئے تو مسلمان ایک طرف کوئی غیر مسلم بھی آپ کو بیدار کرے تو اس کا ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ قرآن کے نزدیک ایسے شخص کی کوئی عزت و توقیر نہیں جس کے اعمال و اقوال میں مطابقت نہو۔ مسلمانوں کی کسی ممتاز صف میں اسے جگہ نہیں مل سکتی کیونکہ قرآن کے معیار کے مطابق۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

اللہ کے نزدیک وہی زیادہ بزرگ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

لیکن آپ اپنی اصلاح کے لئے انظر ما قال و لا تنظر من قال (یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے نہ یہ کہ کہنے والا کون ہے) کو پیش نظر کیوں نہ رکھیں محتسب اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اسی طرح اسے ٹوکنے والا کوئی اور مل جائے گا۔ آپ کو تو اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اسنے خبردار کر دیا کہ سنبھل کر قدم رکھنا آگے ہلاکت و تباہی کا عمیق و مہیب غار ہے نہ یہ کہ اس کی طرف سے انتقامی جذبہ پہلو میں رکھ کر ٹوہ میں رہا جائے کہ کب اسے ٹوکنے کا موقع ملتا ہے لیکن آج سب سے بڑا ماتم یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ کوئی غلطی نہیں کرسکتا اور باقی سب دنیا غلطی کرتی ہے۔

میں اصل مقصد سے ضمناً کچھ دور نکل گیا کہہ رہا تھا کہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف کئے بغیر حق و باطل کے مقابلہ کے وقت ہماری زبانیں حق کی حمایت کے لئے کھل جانی چاہئیں۔ اس میں اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہونے دیجئے یاد رکھو کہ خدا اور شیطان میں سے بیک وقت ایک ہی کو تم راضی کرسکتے ہو لیکن آج تو یہ حالت ہے بقول اکبر مرحوم۔

مغوی کو بُرا مت کہو ترغیب ہے یہ
میں کس سے کہوں نفس کی تخریب ہے یہ

شیطاں کو رحیم کہہ دیا تھا اک دن　　　　اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

پس یقین جانئے کہ یہ صرف آج کی تعلیم ہے۔ قرآن کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اور ہمیشہ یاد رکھئے کہ نرم روی، سلامت پسندی، پاس خاطر، نہایت عمدہ عادات ہیں لیکن بشرطیکہ ان میں ایمان سلامت رہ جائے یہ نہ ہو کہ ؎

معشوق ما بشیوهٔ ہر کس موافق است　　　　باما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

اس منافقت سے تو یقیناً وہ کفر اچھا جس میں ظاہر و باطن کی مطابقت ہو۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔ (غالب)

قرآن نے صرف دو راستے بتائے ہیں قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ - حق اور باطل کفر اور اسلام، کذب و صدق، شرک اور توحید۔ اہرمن اور یزداں ان میں سے جس پر دل ٹھکے اسے اختیار کر لو مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ لیکن ان دونوں کے بین بین کوئی تیسری راہ قرآن میں نہیں ملتی۔ اگر تمہارا دل کوئی ایسی راہ پیش کرتا ہے اور دلیل یہ لاتا ہے کہ اس میں سلامت روی اور ہر دلعزیزی ملتی ہے تو یاد رکھو یہ نفس شریر کا دھوکہ ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ - (۲-۳-۲)

ایسے لوگ اللہ اور (اس کے) مومن (بندوں) کو دھوکا دینا چاہتے ہیں (لیکن حقیقت یہ ہے کہ) وہ خود اپنے نفس کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

شیطان جو پہلے دن سے ہی ذریت آدم کے پیچھے لگ گیا تھا۔ کبھی تو وہ خوف اور امید کے مہیب اور خوشنما دیوتاؤں کی شکل میں باہر سے حملہ کرتا ہے اور کبھی خود انسان کے حجلۂ دماغ میں ہر دلعزیزی اور عزت طلبی کے گمراہ کن مفہوم کی فریب کاریوں اور باطل آرائیوں کے ساتھ اندر سے حملہ آور ہوتا ہے۔ پس اس کے تباہ کن حملوں سے بچنے کے لئے قرآن کا یہ فیصلہ ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے۔

لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۳-۱)

(حقیقی) عزّت تو صرف اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے، لیکن یہ منافق (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں۔

بختِ ناسازگار

شبے اختر شناسے گفت با من — کہ دورِ کوکبت ناسازگار است

بدو گفتم "غلامِ" آں خدایم — کہ او را بر کواکب اختیار است

حقیقت عصیاں

شبے ابلیس ایزد را ہمے گفت — کہ انسانت زبون و خود فروش است

تو بہرِ او مرا از خویش راندی — ولیکن او مرا حلقہ بگوش است!

فلسفۂ توبہ

بکن توبہ یکے و آنگہ بیندیش — کہ ایں عہدِ مُوثّق با کہ بستی!

ازاں توبہ چہ سود است اے گنہگار — کہ دیشب کردی و امشب شکستی!

کلیم سینائی

قیاس کن تو کجائی و من کجا واعظ!

آپ کسی دیوانی عدالت میں جائیے جہاں مدعی اور مدعا علیہ دونوں مسلمان ہوں عدالت کی طرف سے سوال ہوگا کہ معاملہ متنازعہ فیہ کا فیصلہ قانونِ شریعت کی رُو سے کیا جائے یا رواج کے مطابق۔ مدعی اس پر غور کرے گا کہ کونسے مسلک کے مطابق فیصلہ سے اسے زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے اگر وہ سمجھے گا کہ رواج کے مطابق فیصلہ سے اسے زیادہ فائدہ کی امید ہے تو وہ بلا تامّل کہہ دے گا کہ وہ اپنے مقدمہ کا فیصلہ رواج کے مطابق چاہتا ہے۔

آپ ہندوستان کے کسی مولوی صاحب سے پوچھئے۔ کسی فرقہ کے عالم سے دریافت کیجئے۔ جمعیت العلما کے کسی رکن سے فتویٰ طلب کیجئے۔ ہر ایک بلا ادنیٰ توقف کہدے گا کہ مدعی کا یہ فیصلہ اسلام کی کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ قانونِ الٰہیہ سے سرکشی ہے۔ شریعت حقہ کی توہین ہے۔ اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہوا معاملات کے تصفیہ میں رواج کو شریعت پر ترجیح دے۔ اگر وہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں رواجی مسلک کو پسند کرتا ہے تو اسے اپنی پیشانی سے "مسلمان" کا لیبل اتار دینا چاہیئے۔ جب تک وہ اپنے آپ کو اسلامی نظام سے وابستہ سمجھتا ہے یا ایسا ظاہر کرتا ہے تو اس پر قانونِ شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلائے اور اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے قانونِ شریعت کو علانیہ ٹھکرا کر۔ رواج کی پابندی اختیار کرے۔

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ"

(اے پیغمبر! تیرے رب کی قسم کہ یہ ایماندار نہیں بن سکتے جب تک کہ اپنے متنازعہ امور میں تجھے (قانونِ شریعت کو) حکم نہ ٹھہرائیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمان وہی ہے جو اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے ہمیشہ خدائی قانون کی

طرف رجوع کریں اور اس کی اتباع اپنے اوپر لازم قرار دیں۔ یہ ایسا بنیادی اور متفقہ علیہ اصول ہے جس میں کسی جماعت کسی پارٹی کسی فرقہ کسی گروہ کے عامی اور عالم کو کوئی شبہ یا اختلاف نہیں ہو سکتا

اب ذرا سوچئے کہ رواج کیا چیز ہے جس کا التزام ایک مسلمان کو مسلمان نہیں رہنے دیتا ہے۔ جس کی اتباع سے انسان خدائی عدالت سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مردود قرار پاتا ہے۔ دھکے دیکر نکال دیا جاتا ہے!!! رواج کسے کہتے ہیں؟ اس کا سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ شریعت اور رواج کا فرق ! بادنیٰ تدبر سمجھ میں آسکتا ہے۔ شریعت اس قانون کا نام ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا اور جو اپنی محسوس و مشہود اکمل و احسن شکل میں عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں دنیا پر متمکن و مسلط ہوا۔

اس کے برعکس رواج اس قانون، یا ضابطہ کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو اور کسی قوم یا فرقہ میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آرہا ہو مثلاً کئی برادریوں اور ذاتوں میں رواج ہے کہ وراثت میں لڑکی کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ اب اگر آپ اس رواج کی تحقیق میں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتے جائیں تو آخیر میں آپ کسی نہ کسی انسان تک جاکر رُک جائیں گے یعنی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قانون کی ابتداء فلاں گاؤں کے چودھری سے ہوئی۔ یا فلاں برادری کی پنچایت نے کی۔ اس کی ابتدا ایک انسان سے ہوئی ہو۔ یا انسانوں کے کسی گروہ سے۔ اصل دونوں کی ایک ہے کہ اس فیصلہ کو خدائی سند حاصل نہیں بلکہ یہ انسانوں کا فیصلہ ہے۔ لہذا شریعت اور رواج میں فرق یہ ہوا کہ شریعت خدائی فیصلہ کا نام ہے اور رواج انسانی فیصلہ کا نام ہے۔

اب اسی چیز کو ذرا آگے بڑھائیے۔ انسانی تمدن و عمرانیت کا تقاضا ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ واسطہ پڑے۔ اس کو باہمی معاملات کہتے ہیں معاملات و مقاصد کے اشتراک کی صورت میں باہمی اختلاف و تصادم بھی ناگزیر ہوگا ان اختلافات کے تصفیہ کے لئے ایک نظام قائم کیا گیا جسے نظامِ حکومت کہتے ہیں جس نظامِ حکومت میں معاملات کے فیصلے خدائی قانون کے مطابق ہوں۔ اسے حکومت الٰہیہ یا قرآنی سلطنت کہیں گے۔ اور جس نظام میں یہ فیصلے انسانوں

کی طرف سے ہوں وہ نظام رواجی کہلائے گا۔ یہ فیصلے ایک انسان کی طرف سے ہوں یا انسانوں کی جماعت کی طرف سے اصل پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ فیصلے بہر کیف انسانی اور یہ نظام بہر حال رواجی ہوگا۔ خدائی نہ ہوگا۔ یہ فیصلے کسی مسلمان۔ یا مسلمانوں کی جماعت کسی غیر مسلم یا غیر مسلموں کی جماعت، یا مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت میں سے کسی کی طرف سے ہوں اس سے بھی اصل پر کچھ فرق نہیں پڑ سکتا جس نظام کے فیصلوں کی سند ضابطہ الٰہی تک نہیں پہنچتی۔ وہ نظام رواجی ہوگا۔ خدائی نہیں ہوگا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس رواجی نظام کے بعض فیصلے نظامِ خداوندی کے فیصلوں کے خلاف نہ ہوں لیکن اس سے بھی یہ نظام۔ نظامِ خداوندی نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ نظام چند قوانین یا ان کے مطابق فیصلوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ایک ایسی فضا (Atmosphere) قائم کرتا ہے جس سے سوسائٹی کے رگ و ریشے تک متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسا قالب تیار کرتا ہے جس میں قوموں کی حیات اجتماعیہ کی سیرت و کردار متشکل ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کسی رواجی نظام کے بعض قوانین یا فیصلے خدائی ضابطہ قوانین سے متصادم نہ بھی ہوں تو وہ نظام۔ خدائی نظام کا حریف ہی متصور ہوگا۔ مثلاً آج مروجہ قانون کے کئی فیصلے شریعت اسلامی کے فیصلوں سے متصادم نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ آپ اس نظام کو خدائی نظام نہیں کہہ سکتے یہ نظام بہر حیثیت انسانی اور رواجی ہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی رواجی نظام میں مسلمان صرف الحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہوں لیکن اس پر بھی وہ نظامِ رواجی نظام ہی رہے گا۔ خدائی نظام نہیں بن جائے گا۔ اس لئے کہ خدائی نظام محض اقتصادی مشکلات کا حل ہی نہیں بتاتا بلکہ وہ اس سے کہیں آگے لیجاتا ہے۔ روٹی کا مسئلہ تو انسانی اور حیوانی زندگی کا مشترک مسئلہ ہے۔ خدائی نظام ان مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہے اور یہی بنیادی فرق ہے۔ ایک انسانی یا رواجی نظام اور خدائی یا قرآنی نظام میں۔

ہندوستان میں آج ایک نظامِ حکومت قائم ہے جسے آپ بلا ادنیٰ توقف رواجی نظام کہیں گے۔ ہندوستان کے رہنے والے اس کوشش میں ہیں کہ اس نظام کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے۔

اس مقصد کی مدعی ایک طرف کانگریس والوں کی جماعت ہے۔ یہ اس نظام کو الٹنا چاہتی ہے اس لئے نہیں کہ اس کے بدلے وہ کوئی خدائی نظام قائم کرنا چاہتی ہے بلکہ محض اس بدیشی رواجی نظام کو الٹ کر اس کی جگہ ایک سودیشی رواجی نظام قائم کرلے۔ اس جماعت کے نزدیک موجودہ نظام اس لئے مردود و ملعون نہیں کہ یہ انسانوں کا قائم کردہ نظام ہے بلکہ اس لئے تبدیلی کے قابل ہے کہ یہ نظام ان انسانوں کا قائم کردہ ہے جو ہندوستان کے رہنے والے نہیں بلکہ ایک اور ملک کے باشندے ہیں ان کے نزدیک اس نظام کی بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں کی دولت انگلستان پہنچائی جارہی ہے اور یہاں کے باشندے فاقوں مر رہے ہیں وہ اس نظام کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں تاکہ یہاں کی بھوک اور افلاس دور ہو۔ وہ اس نظام کی جگہ اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ان کا دعوےٰ ہے کہ اس نظام میں ہندوستان کے تمام باشندے ہندو مسلم۔ سکھ۔ عیسائی۔ پارسی وغیرہ سب شریک ہوں گے۔ اس جدوجہد کا نام ہے جنگ آزادی۔

ظاہر ہے کہ جس بنیاد پر کانگریس والوں کے نزدیک موجودہ نظام ناقابلِ قبول ہے ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ اپنا نظام قائم کرنے سے وہ علت ضرور دور ہو جائے گی۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ اگر موجودہ نظام کا نام غلامی اور اپنے نظام کا نام آزادی رکھتے ہیں تو ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان کے نزدیک یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے مسلمان کے نزدیک جملہ نظام ہائے عالم دو شقوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یا وہ نظام رواجی ہوگا یا خدائی۔ ان کے نزدیک ہر رواجی نظام ناقابلِ قبول اور الٹ دینے کے لائق ہے تاکہ اس کی جگہ خدائی نظام قائم کیا جا سکے۔ رواجی نظام کے قائم کرنے والے ولایت کے باشندے ہوں یا ہندوستان کے ہندو ہوں یا مسلمان۔ یا ہندو اور مسلمان مشترکہ۔ ایسا ہر نظام ان کے نزدیک مردود و ملعون ہے۔ ایسے نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنا ان کے زاویۂ نگاہ سے غلامی ہے۔ خواہ اس نظام کے قائم کرنے والے دوسرے ملک کے رہنے والے ہوں یا خود اپنے ملک کے۔ لہٰذا جس چیز کا نام کانگریس والوں کے نزدیک جنگ آزادی ہے وہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے جنگ آزادی نہیں بلکہ ایک رواجی نظام کے جگہ دوسرے رواجی نظام کا قیام ہے۔ کانگریس والوں کے نزدیک اس تبدیلی نظام کا سب سے بڑا فائدہ معاشی مشکلات کا حل ہے یعنی اس سے

ملک کی دولت اہل ملک کے ہاتھوں میں رہے گی۔ اس لئے وہ لوگ جن کی نگاہوں میں زندگی کی حدود و قیود محض مادی حوائج و ضروریات کی چار دیواری ہے انہیں کانگریس کا ہمنوا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ ایسے مسلمان جن کے نزدیک "روٹی کا مسئلہ" سب سے اہم مسئلہ زندگی ہے اس تبدیلی نظام کی جدوجہد میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہیں اور ایسا ہونا ہی چاہیئے اس لئے کہ ہم نے جو رواجی اور خدائی نظام کا فرق بتایا ہے اس میں خدائی نظام کے قیام کی کوشش تو انہی کی طرف سے ہونی چاہیئے جو اس کی اہمیت کو محسوس کریں جن کے نزدیک زندگی کی کامرانیوں کا منتہیٰ اقتصادی اور معاشی مشکلات کا حل ہو۔ مذہبی نظام جن کے نزدیک عہد جاہلیت کی یادگار ہو جس کا اس تہذیب و تمدن کے دور میں نام تک لینا بھی خلاف فیشن تصوّر کیا جائے انہیں اس کی کیا پڑی ہے کہ خدائی نظام کے قیام کی فکر کریں۔ ان کے نزدیک ہر وہ نظام جس میں مادّی زندگی کی شادکامی حاصل ہو جس میں روٹی آسانی سے مل سکے ہر لحاظ سے مستحسن اور قابل ستائش ہے۔ اس لئے ہر وہ کوشش جو کسی ایسے نظام کے قیام کے لئے بروئے کار لائی جائے ان کے نقطۂ نگاہ سے عین جہاد ہے۔ اس لئے اس طبقہ کے مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو جانا کچھ بھی تعجب انگیز نہیں۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ موجودہ جنگ آزادی، میں ہندوؤں کے ساتھ وہی مسلمان شریک ہو سکتے تھے جو ایک برے رواجی نظام کی جگہ اچھے رواجی نظام کے قیام کے خواہاں ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی طبقہ ہو سکتا تھا جسے مذہب سے کچھ علاقہ نہ ہو مغرب کی مادّہ پرستی جس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔ اور اس کے برعکس وہ لوگ جو مذہب اور اس کی رُو سے قائم شدہ نظام کی اہمیت سے واقف ہوں انہیں کچھ ایسی جدوجہد کرنی چاہیئے تھی جس سے موجودہ رواجی نظام کی جگہ خدائی نظام کا قیام ہو سکتا۔ آپ جس شخص سے سوال کریں گے وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ اس قسم کی جدوجہد علماء کے طبقہ کی طرف سے ہونی چاہیئے کہ وہ شریعت کے سب سے بڑے محافظ اور نظام خداوندی کے قیام و بقا کے سب سے اولین ذمہ دار ہیں۔ بلکہ اگر حقیقت کو ذرا اور بے نقاب دیکھیئے تو ان حضرات

کی ہستی ہی شریعت کے ساتھ قائم ہے۔ عدالت میں جب کوئی مسلمان شریعت کے مقابلہ میں رواج کے فیصلہ کو ترجیح دیتا ہے تو سب سے پہلے انہی حضرات کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ اس لئے موجودہ دور میں جب کہ ایک رواجی نظام کو الٹنے کی تحریک پیدا ہوئی تھی ان حضرات کو سب سے آگے بڑھ کر کوشش کرنی چاہیئے تھی کہ وہ اس تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر رواجی نظام کی جگہ خدائی نظام کو قائم کرسکیں جس میں انہیں شریعت کا ضابطۂ قوانین نافذ کرنے کی پوری پوری آزادی ہو۔ مغرب زدہ فرنگی مآب۔ مادہ پرست اور مذہب سے متنفر طبقہ کی طرف سے ان کی مخالفت ہوتی تو یہ اس ہجوم مخالفت کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرتے اور ایک طرف انگریز اور دوسری طرف ہندو کو علانیہ بتا دیتے کہ ہمارے نزدیک نہ تمہارا قائم کردہ نظام قابلِ قبول ہے اور نہ وہ جسے ہندو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونو نظام رواجی ہیں اور اس لئے مردود ہیں۔ ہم دنیا کے کسی رواجی نظام میں آزاد نہیں ہوسکتے۔ ہماری آزادی اور اس آزادی کے بہترین نتائج صرف ایک نظام سے وابستہ ہیں اور وہ نظام۔ نظامِ خداوندی ہے۔ یہ حضرات اس جہاد زندگی میں سربکف میدانِ عمل میں آجاتے اور سچے مسلمانوں کی جماعت کو ساتھ لیکر نظامِ خداوندی کی منزلِ مقدس کی طرف والہانہ بڑھتے چلے جاتے۔ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہوتی اور یوں اس خاکدانِ ہند میں وہ انقلاب پیدا ہوجاتا جسے دیکھنے کے لئے لاکھوں آنکھیں پرنم اور ہزاروں قلوب بے تاب ہیں۔

یہ آواز علماء کی طرف سے اٹھنی چاہیئے تھی کہ ہم ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم شریعت اسلامی کے ہر جزئی اور کلی۔ اصولی اور فرعی قانون کو بلا مزاحمت نافذ کرسکیں۔ لیکن اللہ کی قدرت کہ آج تک کسی قومیت پرست عالمِ دین کی زبان سے یہ الفاظ نہ نکل سکے اور نکلے تو اس کی زبان سے جس کی تصویر دکھا دکھا کر یہ علماء لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے رہتے ہیں کہ بتاؤ ایسی تصویر کسی مسلمان کی ہوسکتی ہے؟ ان علماء کبار سے جب کبھی دریافت کیا گیا کہ حضور یہ تو فرمائیے کہ یہ جدوجہد بالآخر کس غرض کے لئے ہے تو ڈانٹ کر یہی جواب ملا کہ بس! مقصد صرف یہ ہے کہ

انگریز کو نکال دو! عرض کیا کہ حضور یہ درست ہے کہ انگریز کا قائم کردہ رواجی نظام مسلمان کے لئے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں لیکن یہ تو ارشاد ہو کہ انگریز کے نکال دینے کے بعد جو نیا نظام قائم ہوگا وہ بھی تو رواجی نظام ہوگا۔ وہ نظام مسلمان کے لئے کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے! ہمیشہ یہ جواب ملا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ انگریز تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسے نکال باہر کرو۔ گذارش کیا کہ حضور! ہمارا دشمن نہ کوئی گورا ہے نہ کالا۔ نہ ہندی ہے نہ ولائتی۔ ہمارا دشمن وہ ہے جو خدائی نظام کی جگہ رواجی نظام قائم کرتا ہے۔ آج رواجی نظام انگریز نے قائم کر رکھا ہے لہذا یہ دشمن ہے۔ کل رواجی نظام ہندو کی طرف سے قائم ہوگا لہذا وہ دشمن ہوگا۔ آج قوت انگریز کے ہاتھ میں ہے اس لئے یہ دشمن نظر آتا ہے۔ کل کو یہی قوت ہندو کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس لئے وہ ان سے بھی بڑا دشمن ہو جائے گا! مسلمان کا دوست تو فقط وہ ہے جو ان کے خدائی نظام کے قیام میں مددگار ہو۔

..... اس کا جواب فتویٰ کفر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔!

اس طرف یہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اللہ کا ایک ایسا بندہ کھڑا ہوا جس کے متعلق ان علماء حضرات کا ارشاد تھا کہ اس کی شکل صورت بھی مسلمانوں جیسی نہیں۔ وہ اٹھا اور اس نے برملا کہا۔ علانیہ کہا کہ یاد رکھو.....

> ہندؤں کی موجودہ جدوجہد۔ انگریز کے رواجی نظام کو الٹ کر اپنا رواجی نظام قائم کرنے کے لئے ہے۔ جو مسلمان کے نزدیک ایسا ہی غلامی کا نظام ہوگا جیسا آج ہے۔ لہذا مسلمان کے نزدیک یہ جدوجہد آزادی کی جنگ نہیں۔ آقاؤں کی تبدیلی کی کوشش ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک آزادی صرف اس حکومت کا نام ہے جس میں وہ قوانین شریعت کو نافذ کر سکیں۔ ایسی آزادی کے حصول کی واحد صورت۔ بحالاتِ موجودہ یہی ہے کہ مسلمان اپنی اکثریت کے علاقوں میں اپنی جداگانہ حکومت قائم کریں۔

آپ تصور میں بھی لا سکتے ہیں کہ کوئی ایسا مسلمان جس کے دل میں مذہب کا کچھ بھی احترام۔ شریعت الٰہی کا کچھ بھی پاس اور خدا کا کچھ بھی خوف ہو وہ اس مسلک کی مخالفت کا خیال تک بھی دل میں لا سکتا ہے! لیکن حوادث زمانہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس اصول و مسلک کی دھڑلے سے مخالفت ہوئی اور ستم بالائے ستم

یہ کہ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو اپنے آپ کو شریعت مقدسہ کا محافظ اور قوانین الٰہیہ کا پاسبان قرار دیتا ہے۔ جلسے ہوئے جداگانہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ تقاریریں ہوئیں مضامین لکھے گئے کس چیز کے خلاف؟ اس اعلان اور نظریہ کے خلاف کہ مسلمان ایسی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے جس میں اس کے خدا کا قانون رائج ہو جس میں شریعت کا سکہ رواں ہو۔ دور کیوں جائیے گذشتہ کرسمس کے ہفتہ میں مسٹر جناح نے کراچی اور احمد آباد وغیرہ میں اپنی مختلف تقاریر میں جب کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ مسلمان ایسی حکومت چاہتے ہیں جس میں ان کی شریعت کا قانون نافذ ہو۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۰ء) تو ہمارے "قومیت پرست مسلمان" حضرات نے جن الفاظ و جذبات سے اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہر اس مسلمان کے لئے درخور اعتنا ہیں جو اپنے سینے میں دل اور دل میں زندگی کی کوئی رمق رکھتا ہے۔ مثلاً بنگال کے سید حبیب الرحمٰن صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"ہندوستان میں کسی اکثریت یا اقلیت کی حکومت نہیں ہوگی بلکہ اس کی زمام حکومت ایسے ہندو اور مسلمان محبانِ وطن کے ہاتھوں میں ہوگی جو نہ صرف مسلمانوں کا ہی اعتماد رکھتے ہونگے بلکہ انہیں ہندوؤں اور دوسری جماعتوں کا بھی اعتماد حاصل ہوگا۔ بالفاظ دیگر یہ جمہور کی حکومت ہوگی۔ جو جمہور کے لئے جمہور کے ہاتھوں سے وجود میں آئے گی۔ مسٹر جناح سخت مغالطہ میں ہوں گے اگر وہ یہ سمجھیں کہ کانگریس مجلس احرار۔ بنگال کرشک پرجا پارٹی جمعیت العلماء جمعیت المومنین وغیرہ کے قومیت پرست ان سے (مسٹر جناح) سے کسی طرح بھی مسلمانوں کے کم خیر خواہ یا کم محبِّ وطن ہیں۔۔۔۔۔۔

نزاکتِ وقت کا تقاضا ہے کہ تمام قومیت پرست مسلم لیڈر جنھیں ہندوستانی مسلمانوں کی راہ نمائی کا فطری حق حاصل ہے آگے بڑھیں اور ہندوؤں کے ساتھ ایک ایسا سیاسی معاہدہ کریں جس سے مسٹر جناح اور ان کے ہمنوا مسلمانوں کی یا تو اصلاح ہو جائے یا ان کا خاتمہ ہو جائے۔" (ہندوستان ٹائمز ۱/۴۱ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ کونسا خطرہ ہے جس کے مقابلہ کے لئے ہندوستان کے تمام قومیت پرست مسلمانوں کو یکجا ہو کر ہندوؤں سے رشتہ مواخات استوار کرنے کی دعوت دیجارہی ہے! خطرہ یہ ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی، ہندوستان کے ایک گوشے میں ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں شریعتِ اسلامی کا ضابطۂ قوانین نافذ ہوگا! یَالَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا۔

یوں تو نورِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی روزِ اول سے ستیزہ کار چلا آرہا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ ستاروں کی آنکھوں نے دنیا کے اسٹیج پر ایسا تماشا شاید ہی کہیں دیکھا ہو کہ مسلمان علماء کا گروہ۔ اپنے جبّوں اور قبوں۔ عماموں اور قباؤں۔ تسبیحوں اور مصلّوں سے آراستہ پیراستہ۔ غیر مسلموں سے عہد و پیمان قائم کرکے۔ ایک متحدہ محاذ اس غرض سے قائم کر رہا ہو کہ ملک کے کسی گوشے میں کہیں ایسی حکومت نہ قائم ہو جائے جس میں شریعت الٰہی کا قانون نافذ ہو! اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک ۔۔۔ سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بیں

بھیڑیوں سے گلہ کی حفاظت کیجا سکتی ہے۔ لیکن جب خود چرواہا ہی انہیں بھاڑ پھاڑ کر کھانے لگ جائے تو اس گروہ کا خدا حافظ! ڈاکوؤں سے گھر کی حفاظت کا انتظام کیا جا سکتا ہے لیکن جب اہل خانہ۔ اور ان میں سے بھی بزرگانِ خاندان گھر کو لوٹنے لگ جائیں تو اس کا انتظام کسی سے نہیں ہو سکتا۔ دریا کی بے پناہ موجوں سے کشتی کو بچایا جا سکتا ہے لیکن جب ناخدا ہی اسے ڈبونے پر تل جائے تو اس کشتی کے ساحلِ مقصود پر پہنچنے کی کوئی توقع نہیں کیجا سکتی! لیکن اس پر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا نے آذر کے گھر میں ابراہیمؑ کو پیدا ہوتے اور فرعون کی گود میں موسیٰؑ کو پرورش پاتے دیکھا ہے۔ جس کی حفاظت اللہ چاہتا ہو اس کے لئے وہ ایسے ایسے مقامات سے سامان و ذرائع پیدا کر دیتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں! اس کا زندہ ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آج علم و فضل کی بڑی بڑی گدیوں کے پجاری ...

...... بڑے بڑے مفتیانِ عظام و علمائے کرام۔ جید شیوخ الحدیث اور ائمہ دین متحدہ طور پر رواجی نظامِ حکومت کے قیام کی تائید اور خدائی نظامِ حکومت کے قیام کی ہر روز مخالفت کر رہے ہیں۔ اور گہوارۂ مغرب کا پروردہ شدہ یافتہ۔ سرزمین سومنات کا ایک بیرسٹر شریعت الٰہیہ کے تمکّن و تنفیذ کے لئے مصروف

جہاد ہے۔ ذَالِکَ فضل اللہ یؤتیہ من یشاء سچ ہے جب وہ چاہے تو ایک خشک لکڑی سے موسےؑ کے اژدہا کا کام لے جو ساحرین فرعون کی تمام نظر فریب رسیوں کو نگل جائے۔ اس مقلب القلوب کو شرح صدر کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔

ہمارے قومیت پرست علماء کبار کا ارشاد یہ ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں ہمیں پوری "مذہبی آزادی" ہو گی اور ہم اسلامی کلچر کی حفاظت کے لئے ایک جداگانہ شعبہ قائم کرلیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں یہ چیز نہیں آسکتی کہ مذہب اسلام کیا ہے اور اس کی آزادی سے کیا مفہوم ہے۔ مذہبی آزادی سے ان کی مراد نماز۔ روزہ کی آزادی سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک مذہب نام ہی ان چند ظواہر ورسوم کا ہے۔ اگر ان کی ادائیگی میں کوئی مانع نہ ہو تو ان کے نظریہ کے مطابق پوری پوری مذہبی آزادی ہو گی لیکن اگر یہی مذہبی آزادی ہے تو ایسی مذہبی آزادی تو آج کل بھی حاصل ہے! یہ تمام چیزیں دراصل اسی کہنہ عجمی تصوّر کی شاخیں ہیں جس کی رو سے دین کو سیاست سے الگ کیا گیا تھا۔ ہمارے علماء حضرات نے سیاست میں حصّہ لینا بھی شروع کیا ہے تو ایک دینی فریضہ کی رُو سے نہیں بلکہ محض فیشن کے طور پر تاکہ یہ ماڈرن (Modern) قسم کے مولوی کہلائیں۔ ورنہ دین اور سیاست کی وہ تفریق اسی طرح باقی ہے۔ موجودہ "جنگِ آزادی" ان کے نزدیک ایک خالص دنیاوی مسئلہ ہے۔ جسے مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس لئے ہمارے علماء کرام اس "جنگِ آزادی" میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہیں کیونکہ دنیاوی معاملات میں غیروں کے ساتھ اس قسم کے اشتراک وتعاون سے کوئی چیز مانع نہیں۔ چنانچہ یہ حضرات اپنے مسلک کی تائید میں دلائل بھی اس قسم کے پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنی مسجد کا نقشہ ایک ہندو انجینئر سے بنوا سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے امراض کا علاج ایک غیر مسلم ڈاکٹر سے کرا سکتے ہیں تو موجودہ سیاسی مسائل کے حل کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت کیوں نہیں بنا سکتے! آپ بادنیٰ تدبّر محسوس کریں گے کہ ان تمام خیالات کی تہ میں وہی جذبہ پنہاں ہے کہ مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے ہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ **دین** سے مراد ہے۔ اطاعت۔ اقرار محکومیت جس کی حکومت ہو گی اسی کا **دین** ہو گا یا یوں کہئے کہ جس قسم کا نظامِ حکومت ہو گا اسی قسم کا **دین** ہو گا۔ شریعت۔ سے مراد ہے **قانون** اور عبادت کے معنی ہیں اس قانون کی اتباع واطاعت۔ اب ذرا اس بوالعجبی کو

دیکھئے کہ نظامِ حکومت تو ہوگا ہندوؤں اور مسلمانوں کا مخلوط جمہوری یعنی رواجی جس میں اکثریت بھی غیر مسلموں کی ہوگی، اور "دین کی آزادی" ہوگی! "مذہبی آزادی" کی تفصیلات میں الجھے بغیر ایک بات تو بداہۃً سمجھ میں آسکتی ہے کہ قانونِ شریعت کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جس کا ایک سرا اگر ایک مسلمان کے دامن سے وابستہ ہے تو دوسرا کسی غیر مسلم کے گریبان سے مثلاً ابھی اگلے دنوں کلکتہ ہائی کورٹ نے ایک عجیب فیصلہ دیا ہے۔ ایک عیسائی خاتون نے اسلام قبول کرنے کے بعد درخواست دی کہ چونکہ اس کا خاوند اسلام قبول نہیں کرنا چاہتا اس لئے اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے۔ عدالت نے کہہ دیا کہ یہ معاملہ ملک کے عام قانون کی رُو سے فیصل ہوگا جس میں ایسی صورت میں نکاح فسخ نہیں ہو سکتا۔ آپ کہہ دیں گے کہ یہ موجودہ غلامی کا نتیجہ ہے لیکن ہم یہ گذارش کریں گے کہ ذرا گاندھی جی سے پوچھئے کہ انگریز کے نکال دینے کے بعد جس قسم کا نظامِ حکومت یہاں قائم ہوگا اس میں اگر ایک ہندو عورت اسلام قبول کرنے کے بعد اس قسم کی درخواست دے گی کہ اس کے ہندو شوہر سے اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے تو کیا اس وقت کا مروّجہ قانون اس کی اجازت دے گا! ذرا دیکھئے تو سہی کہ وہاں سے کیا جواب ملتا ہے! یہ تو ایک مثال ہے اس قسم کے سینکڑوں معاملات ہیں جن میں آپ مخلوط رواجی نظامِ حکومت کے ماتحت قوانین شریعت کو نافذ کر ہی نہیں سکتے۔ شریعت اسلامی ایک مکمّل ضابطہ کا نام ہے جو پورے کا پورا نافذ ہوا کرتا ہے اس کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ پھر یہ سادہ لوحی بھی ملاحظہ ہو کہ اسلامی کلچر و ثقافت کے تحفظ کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا جائے گا۔ گویا ثقافت ایک ایسی جنس ہے کہ غیر خدائی نظامِ حکومت کے اندر ایک شعبہ قائم کر دینے سے اس کی حفاظت ہو جائے گی۔ حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ثقافت تو نام ہی ان رجحاناتِ تعلیم و دینی اور نظریاتِ زندگی کا ہے جو کسی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ہمارے ان علماء کرام کا یہ خیال بھی اس لئے ہے کہ ان کے نزدیک ثقافت (کلچر) سے مفہوم چند معاشرتی تراش خراش اور قطع و برید کا مجموعہ ہے جس کی حفاظت ایک الگ محکمہ کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ان معروضات کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے گا کہ دین کے معاملہ میں "علمائے کبار" ہی سند ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ انہیں دین کی باتیں سمجھائے! بہت اچھا یونہی سہی! لیکن ذرا دیکھئے کہ جو کچھ ہم نے گذارش کیا ہے اس کے متعلق خود علماء حضرات کو اپنے ہاں سے کیا فتویٰ ملتا ہے۔ حضرت علامہ ابوالحامد محمد بن عبداللہ صاحب

انصاری (مقیم کابل) نے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ کے نواسہ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب علیہ الرحمۃ کے تلامذہ میں سے ہیں "اساس انقلاب" کے نام سے ایک مختصر لیکن نہایت عمدہ کتاب تحریر فرمائی ہے جس کا تعارف مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت العلماء صوبہ آگرہ نے کرایا ہے۔ اس کتاب میں وہ ارشاد فرماتے ہیں

اوّل وہ جماعت جو کہ اسلام کو بحیثیت ایک مذہب کے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے۔ یعنی یہ حسب خدائے کریم کی غیر سیاسی (انفرادی اور مذہبی) طور پر مالکیت۔ حاکمیت اور توحید پر اور حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی (غیر دولتی) خاتمیت" اور آخرین قوت تبلیغی و اجرائی حکومت الٰہی ہونے" پر دل سے یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر ایک نہ ایک غیر الٰہی (شخصی یا دستوری یا جمہوری یا اشتراکی یا فسطائی یا ان کے سوا کسی) حکومت کی رعیت اور وفادار عبید و مملوک ہوتی ہے ان مومنین کی بھیڑ۔ اگرچہ بحیثیت اجتماعی اسلام سے دور ہے لیکن ان کو مذہب اسلام (انفرادی طور پر پابندیٔ اسلام) کا حق ہر حکومت دیتی ہے اور میں بھی ان کو آزادی فردی کی رو سے مذہبی رنگ کا مسلمان سمجھتا ہوں۔ قابل تصریح ہے کہ مذہبی رنگ کا اسلام "جو کہ غیر الٰہی حکومتوں کے زیر سایہ غلامی کی زندگی بسر کرتا ہے" نام ہی کا اسلام ہے۔ اور اصل اسلام وہی اجتماعی یا سیاسی اسلام ہو سکتا ہے جس کی قوت نے دنیا کے کسی حلقے پر خدا ملیک و مقتدر کی حکومت کا جھنڈا رسول اکرمؐ اور صدیق اکبرؓ کے نمونہ پر کھڑا کر رکھا ہو۔ اس لئے یہ اصحاب مذہب اسلام تاوقتیکہ خدائے ملک الناس کی نسبت توحید حاکمیت کے عقیدہ کے ساتھ اس عقیدہ کی عملی تبلیغ اور اصلاحی جہاد اکبر کے لئے کوئی سیاسی مرکز پیدا نہ کریں اور اس سے سیاسی طور پر مربوطیت رکھتے ہوئے اس کے زیر اثر شوریٰ اصول پر امر اجتماعیات نہ رکھتے ہوں اس وقت تک یہ لوگ اصلی اور مطلوب الٰہی اور ابراہیم علیہ السلام کے اصطلاحی اسلام سے محروم ہی رہیں گے اور ان کو ننگِ اسلام سے زیادہ کوئی خطاب نہ دیا جا سکے گا۔[1] (صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

---

[1] اس کتاب کی زبان اسی قسم کی ہے۔ اس لئے بغور پڑھنے سے مطلب واضح ہوگا۔

اسی طبقہ علماء کے متعلق وہ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :-

یہی وجہ ہوئی کہ : جہالت دیدہ عرب و عجم، جلد ہی حکومت فطری الٰہی کے تصور سے محروم کیا جا سکا۔ اور اسی سانحۂ ظلم و ستم کا یہ اثر ہے کہ : آج کا مدعیٔ اسلام عالمِ اسلامی نظامِ سلطنت سے عاری اور اس کا علمی زبردست ذخیرہ اس کی بحث و تحیص سے خالی، اس کا دماغ افقِ جہانبانی کے تصور سے نا آشنا، اور اس کا حافظہ اس صحیح قرآنی حاکمیت کی تصویر کی یاد تک سے محروم ہے جس کو کہ حضرت محسنِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا کی روشنی بخش تاریکی میں جمکر حاصل کیا اور اپنا اور اپنوں کا خون بہا کر عرب میں قائم فرمایا تھا۔ اس عذر و خیانت، اور قومیت پرستانہ عذر و خیانت، "کا منحوس اثر ہے کہ خدا پرستی، حکومت فطری جلد مٹ کر اس کی جگہ ایسی فرعونی۔ شدادی حکومتیں قائم ہوئیں جن کو حضرت رسول الرحمۃ تک نے ملوکیت عضوض و جبابرہ کا لقب دیا۔ اسی کا اثر ہے کہ مدعی اسلام جماعت کا اولوالعزم مرد کار آج غلامانہ ذہنیت کا عظیم الشان بادشاہ ہو۔ وہ مارکس لینین، ہٹلر، مسولینی کے اصول کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر نہیں شرماتا۔ اس کا دل عبدیت عباد کے تباہی افزا، شرف کش، حریت فنا کھیل سے کبھی نفرت نہیں کرتا۔ اس کو اگر بیر ہے اور للّٰہی بیر ہے تو زندہ جاوید، روح آزادی، شرف انسانی اور ان سب کی محافظ حکومت الٰہی اور سعادت بخش تابعیت ملک النّاس کے فطری مسلک سے" (صفحہ۔۔۔)

یہ حقیقت کہ ان حضرات کے نزدیک دین سے مفہوم چند ظواہر و رسوم سے زیادہ کچھ نہیں ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں -

اس لئے یہ عجیب و غریب مدعی اسلام و دعویدار اقامتہ نماز گرد ہ لمبی سے لمبی نمازیں پڑھ سکتی ہے۔ ہر سال کے حج کا پروگرام چلا سکتی ہے۔ منبر پر چڑھ کر گھنٹوں وعظ فرما سکتی ہے۔ خانقاہوں میں آنکھیں بند، سانس بند مراقبہ کی آرام دہ صورت میں شبا روزوں مجاہدات کر سکتی۔ مدرسوں میں رونق افروز ہو کر قال اللہ وقال الرسول کا رنگ جما سکتی ہے۔ میلوں ٹھیلوں کی رنگینیوں میں ہفتوں غرق رہ سکتی ہے۔ پیروں۔ قبروں کی پرستش سے ایمان تازہ کر سکتی ہے۔ اور اگر

حاکم وقت کا "مسلم ہو یا کافر" گوشۂ چشم ہو تو آپس کی سر پھٹول میں ایک فریق کی پر جوش قیادت کر سکتی ہے اور ایک مصنوعی قوت حاکمہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر چند گالیاں۔ دو چار گھونسے اور تھپڑ کھانے کی زیادہ سے زیادہ قدریت کا کھیل بھی کھیل سکتی ہے (صفحہ ۵۱۰۵۰)

ستیہ گرہ یعنی جیل چلے جانے کا ہی وہ کھیل ہے جسے ہمارے قومیت پرست حضرات جنگِ آزادی میں سب سے بڑا مجاہدانہ عمل تصور کرتے ہیں جن کا ہر جگہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور جس کی بنا پر آئے دن اپنے مخالفین کو بے عملی اور سرکار پرستی کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔

یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ ایسے جلیل القدر عالم کی بارگاہ سے جو ایک زاویہ نشین کتابی عالم ہی نہیں بلکہ ایسے سیاسی مدبر ہیں کہ شاہ امان اللہ خاں کے عہد میں آپنے متعدد بار "سفارت" اور "وزارت خارجہ" جیسی عظیم الشان خدمات سرانجام دیں مسلک قومیت پرستی کے ان حامیان کو کس قسم کا سارٹیفکیٹ عطا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

یورپ کا مسلمانوں کے دماغ کو شخص پرستی کی پستی سے ابھار کر قوم پرستی کے گڑھے میں دھکیلنا ع ستارہ می شکند آفتاب می سازند کے اور شخصیت پرستی سے نجات کے بعد اصول قوم پرستی میں ان کی اسارت مدینہ سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑے ہونے کے مرادف ہے اس لئے اس کا وقف عمل عالم مدعی اسلام شخص پرستی اور یا قوم و وطن پرستی کے اوپر پختہ تربیت کئے جانے کی علت سے، عبدیت محمدی، حنیفیت ابراہیمی توحید اسلامی، اور روح سیاسی قرآنی کے بالکل خلاف اور خدا پرستی کے بالکل ضد اور منافی ہے۔ اس لئے۔ (اس کی موجودہ حیثیت ایک بد آموز جماعت سے زیادہ قطعاً نہیں ہے) (صفحہ ۶۰۰۵۹)

یہ اس کتاب کے اقتباسات ہیں جن کے متعلق جناب ناظم صاحب جمعیت العلماء صوبہ آگرہ کا ارشاد ہے کہ

"علماء ملت جو قوم اور ملت کی بہبودی کے عاشق ہیں ان کا پہلا فرض ہے کہ اس کا مطالعہ فرمائیں اور اس کی تعلیم کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل اور اپنی جدّ و جہد کا محور قرار دے لیں"

کیا ہم جناب ناظم صاحب سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان کے اس ارشاد کے مخاطب دوسرے ہی ہیں یا خود ان کی جماعت بھی ہے! اگر ان کی جماعت بھی ہے تو جمعیت العلماء کے مسلک قومیت پرستی

کے متعلق کیا ارشاد ہے!

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہمارے علماء عظام کی اپنے مسلک کی تائید میں سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنا ضروری ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مسٹر جناح نے جب اعلان کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لئے ایک ایسی آزاد حکومت چاہتے ہیں جس میں وہ قوانین شریعت کو نافذ کر سکیں۔ تو اس قسم کی حکومت میں انگریزوں کے باقی رہنے کا امکان بھی ہے؟ کانگریس جس قسم کا نظام حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اس میں تو اس امر کی گنجائش بھی ہے کہ ہندوستان کو انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں رہنے دیا جائے لیکن جس نظام حکومت میں توانین خدائی نافذ ہوں۔ کیا اس میں کسی غیر کی حکومت یا اقتدار کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے! کانگریس نے ابھی تک کبھی کھلے کھلے الفاظ میں اعلان نہیں کیا کہ وہ کس قسم کی حکومت کے اصول کے لئے کوشاں ہے اور کس حد تک وہ انگریزوں کے عمل و دخل کو روا رکھ سکتی ہے اس لئے گاندھی جی نے آج تک اپنے "پورنیہ سوراج" کی کوئی جامع تعریف (Definition) یا تشریح نہیں کی۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو درجۂ نوآبادیات (Dominion Status) سے راضی ہو جائے گا۔ چنانچہ کانگریس نے جنگ میں مدد دینے کے لئے جو شرطیں کی تھی وہ یہی تھی کہ انگریز اس امر کا اعلان کر دیں کہ جنگ کے فوری بعد درجۂ نوآبادیات دیدیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندو کس حد تک انگریز کو یہاں سے "نکالنے" کا متمنی ہے۔ لیکن بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ مکمل آزادی چاہتا ہے جس میں انگریز کا کوئی اقتدار باقی نہ رہے۔ تو مسئلہ کی نوعیت یوں ہو جائے گی کہ

(۱) کانگریس چاہتی ہے کہ انگریزوں کی حکومت کو کلیتہً مٹا کر خود ہندوستانیوں کا نظام حکومت قائم کیا جائے۔ اور

(۲) مسٹر جناح یہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت کو کلیتہً مٹا کر موجودہ نظام کی جگہ ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے جس میں شریعت غرّ ہٰی کے قوانین نافذ ہوں۔

چنانچہ مسٹر جناح نے ابھی اگلے دنوں اپنے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ ہندوؤں سے کہو کہ تقسیم ملک کے

مطالبہ کی مخالفت نہ کریں اگر وہ اس پر رضامند ہو جائیں تو اس کے بعد اگر میں زندہ رہا اور گاندھی جی بھی زندہ رہے تو وہ دیکھ لیں گے کہ میں کس طرح دنیا کی ہر طاقت کو برملا کہہ دوں گا کہ وہ ہندوستان سے دستکش ہو جائے اب فرمائیے کہ ایک مسلمان کے لئے شق اوّل (یعنی موجودہ نظامِ حکومت کی جگہ ایک اور رواجی نظامِ حکومت) قابلِ قبول ہو سکتا ہے یا شقِ "دوم (یعنی موجودہ حکومت کی جگہ ایک ایسی آزاد حکومت جس میں شریعت کے قوانین نافذ ہوں)" بات بالکل واضح ہے لیکن اگر اس کے بعد بھی یہی کہا جائے کہ مسٹر جناح نے جداگانہ قومیت اور جداگانہ ملک یعنی (قیام پاکستان) کی تحریک گورنمنٹ کے ایماء پر جاری کر رکھی ہے "تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہ ہو سکے اور اس طرح انگریزوں کو یہ کہنے کا بہانہ مل جائے کہ جب تک تم باہمی اختلافات کو نہ مٹاؤ ہم کوئی اصلاحی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ تو اس ہٹ کا کیا علاج ؟ ایک ایسی تحریک جس کا بنیادی مطالبہ ایک ایسی حکومت کا قیام ہو جس میں قوانین شریعت نافذ ہو سکیں۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ "انگریزوں کے ایما" پر چلائی جا رہی ہے۔ نفس حیلہ جو کی فریب کاری نہیں تو اور کیا ہے! جن اربابِ بصیرت کی نگاہیں حقائق پر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ انگریز اور ایک انگریز ہی کیا' دنیا کی ہر قوت۔ ہندوؤں کی "مکمل آزادی" کو ہزار مرتبہ برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن کوئی طاقت حکومتِ الٰہیہ کے قیام کو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ چراغ کی آمد ہی اندھیرے کی موت ہے اس لئے یہ کہنا کہ چراغ روشن کرنے کی تجاویز اندھیرے کے ایما سے ہو رہی ہیں۔ یہ سمجھنا کہ طلوعِ آفتاب کی کوششیں چمگادڑ کے اشارے پر عمل میں آ رہی ہیں۔ ابلہ فریبی نہیں تو فریبِ نفس ضرور ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ان مولوی صاحبان کو احساس ہی نہیں کہ حکومت الٰہیہ یا قانونِ شریعت کی حکومت کسے کہتے ہیں ورنہ یہ ایسی باتیں کبھی نہ کرتے ؟ حکومتِ خداوندی میں "سجدے" ایسے معصوم نہیں ہوا کرتے کہ باطل کی قوتیں ان کی یوں اجازت دیدیں جیسے آج کل آپ کو اجازت حاصل ہے۔ یا جیسے ہندو آئندہ نظامِ حکومت میں اس اجازت کی ضمانت دے رہا ہے۔ معاف فرمائیے آپ سے زیادہ انگریز کو علم ہے کہ حکومتِ خداوندی سے کیا مفہوم ہے۔ انگریز تہذیب کا فرزند تو ضرور ہے لیکن "ابلہ مسجد" نہیں ہے وہ قرآن کی بے نیام شمشیر سے خوب واقف ہے اس لئے ایسی حکومت کے قیام کی تحریک جس میں قوانین شریعت نافذ ہو سکیں۔ انگریز کے ایما سے وجود کوش نہیں ہو سکتی۔ آپ کی عہد غلامی کی تفسیریں کچھ ہی کہیں

لیکن وہ جانتا ہے کہ جاء الحق وزہق الباطل کی برق خاطف سے کیا مفہوم ہے۔ اس لئے کہ آپ کی نگاہوں سے اس تجلی کی چمک کو درمیانی دور کے عجمی تصورات کے بادلوں نے اوجھل کر رکھا ہے۔ لیکن یورپ اس ہوش ربا منظر کو ابھی تک نہیں بھول سکا جب جلال خداوندی کی یہ باطل سوز بجلی۔ فاران کی چوٹیوں سے کوندتی ہوئی ساری "مہذب دنیا" کی نگاہوں کو خیرہ کر گئی تھی۔ دانشمند فرنگ نہ گاندھی جی کے چرخے سے ڈرتا ہے نہ جواہر لعل کی سوشلزم سے

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے

مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں مسلمانوں کی آزاد حکومت کا قیام جس میں قوانین شریعت نافذ ہوں۔ شیشہ گران فرنگ کی مہرہ بازی کی آئینہ دار ہے سیاست افرنگ کے متعلق بہت بڑا غلط اندازہ ہے۔ ہمارے یہ علماء حضرات اہل دہر کا قیاس اپنے اوپر کر رہے ہیں اور یہی ان کی بنیادی غلطی ہے۔ جو لوگ ہندو جیسی ناآشنائے رموز سیاست قوم کے دام تزویر میں اس آسانی سے گرفتار ہو جائیں وہ بھلا شاطران یورپ کی نگاہوں کا صحیح اندازہ کیا کر سکیں گے۔ اس کے لئے تو کوئی جناح ہی چاہئے تھا۔

حقائق آپ کے سامنے ہیں ان پر غور کیجئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ مسٹر جناح اور ہمارے قوم پرست حضرات (بالخصوص علمائے کرام) میں سے کون حق پر ہے۔ اور اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مسٹر جناح کی جد و جہد فی الواقعہ مسلمان کی سرفرازی و سربلندی اور شریعت حقہ کے تمکّن و ترویج کے لئے ہے تو پھر قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی پر غور فرمائیے :-

كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کشمکش میں آپ کے ذمہ کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور آپ کس حد تک ان سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں اگر آپ کو اس بات میں کوئی شکوک و شبہات ہوں تو ہمیں لکھئے ہم ان کے ازالہ اور آپ کے اطمینان کے لئے کوشش کریں گے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔ یاد رکھئے ہم اس وقت ایک بڑے نازک دور میں سے گذر رہے ہیں۔ رفتار زمانہ کے ہاتھوں واقعات ایسے پیدا ہو رہے

ہیں کہ موجودہ نظام ہائے زندگی میں تبدیلیاں ہو کر رہیں گی۔ جو قوم ان انقلاب آفریں حالات سے فائدہ اٹھا جائے گی مستقبل اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ہندو اور ان کے ہم نوا قومیت پرست حضرات کی تمام تگ و دو کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ موجودہ بدیشی رواجی نظام حکومت کی جگہ سودیشی رواجی نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہو۔ اس کے برعکس خدا کا وہ مخلص بندہ کہ

خرد نے جس کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے جس کو حدیثِ رندانہ

دن رات اس جدوجہد میں مصروفِ عمل ہے کہ اس انقلاب سے فائدہ اٹھا کر زیادہ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے دو ایک گوشوں میں ایسی آزاد حکومت قائم کر لیجائے جس میں شریعتِ اسلامی کے قوانین نافذ ہوں۔ دنیا بھر کی قوتیں اس کی مخالف ہیں۔ بیگانے تو بیگانے خود اپنوں کی یہ حالت ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر قدم قدم پر اس کے راستے میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ پھر بدبختی یہ کہ جو بظاہر ساتھ ہونے کے مدعی ہیں ان میں بھی بالعموم یہ حالت ہے کہ اپنے ذاتی اغراض و مصالح کی خاطر خنجر در آستیں پھر رہے ہیں۔ اس ہجوم مخالفت میں خدا کا یہ بندہ ایک بحرِ موّاج میں روشنی کے بلند مینار کی طرح حقانیت و صداقت کا نصب العین لئے کوہ آسا کھڑا ہے اس مردِ دانا و رہبرِ فرزانہ کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ مدد اس کی مدد نہیں اسے اپنی ذات کے لئے تو کچھ بھی درکار نہیں۔ اسے آپ کی امداد خود آپ کی امداد کے لئے درکار ہے۔ آپ اس کی مدد کریں گے تو عزّت کی زندگی اور طمانیت کی موت نصیب ہوگی اس دنیا میں سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی میسّر ہوگی۔ یوں ہی بیٹھے رہیں گے تو وہ پکارتا پکارتا اس وادیٔ پرخروش سے گذر جائے گا اور پھر کوئی ایسا بھی نہ ہوگا۔

جو کرے تعزیتِ مہر و وفا اس کے بعد

آج سرزمین ہند کا ذرّہ ذرّہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ کون ہے جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے ایثار و اخلاص کی متاعِ گراں بہا کو ساتھ لئے ہوئے میدان میں آجائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ کی پکار کے جواب میں نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ کی آواز کدھر سے بلند ہوتی ہے۔

قربانی کے احکام از روئے قرآن

(چودہری غلام احمد صاحب پرویز کی تقریر جو بتقریب عید الاضحیٰ - دہلی ریڈیو اسٹیشن سے - ۹ جنوری ۱۹۴۱ء کی شب کو نشر ہوئی - باخذ اجازت ڈائرکٹر - آل انڈیا ریڈیو - شائع کی جاتی ہے - طلوع اسلام)

مختلف اسلامی ملکوں کے نمائندے - جو عید الفطر کے بعد، اپنا اپنا مقامی پروگرام لیکر، ملّتِ اسلامیہ کے مرکز کی طرف روانہ ہوئے تھے - کل عرفات کے میدان میں پہنچ گئے جہاں اُن کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا - امیر ملّت نے خطبہ ارشاد فرمایا - حج کے ارکان سے فارغ ہوئے تو آج صبح منیٰ کے میدان میں جمع ہوکر قربانی کے جانوروں کو اللہ کے نام پر ذبح کیا تاکہ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں اور مقامی محتاجوں کے کھانے کا انتظام ہو - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اجتماع کے لئے یہ مقام کیوں منتخب کیا گیا ؟ یہ قربانی کس جلیل القدر واقعہ کی یاد میں قائم کی گئی ؟ اس رسم کی روح کیا ہے اور اس روح کا ماحصل کیا ؟

آج سے قریباً چار ہزار سال پیشتر - سرزمین عراق میں ایک جابر اور سرکش قوم حکمران تھی - حکومت اور دولت کے نشہ نے اُنہیں خدا سے بھلا رکھا تھا - بادشاہِ وقت کی پرستش ہوتی تھی - چاند، سورج، ستارے - حتکہ مٹی اور پتھر کے بُت پوجے جاتے تھے - لیکن، اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اُس نے اس ظلمت اور جہالت کے مرکز سے ایک ایسے عظیم الشان خداشناس کو اٹھایا جو دنیا کے لئے پیام توحید کا مرکز بن گیا - اس برگزیدہ ہستی کا نام تھا حضرتِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام - اس سچائی کے علمبردار نے اللہ کے پیغام کی نشر و اشاعت میں جسقدر تکالیف اٹھائیں - ان کے ذکر کا یہ موقعہ نہیں - اس وقت ہم صرف یہ دیکھینگے کہ اللہ کا یہ مخلص بندہ - اپنے آقائے حقیقی کے ایک ہلکے سے اشارہ پر، برضا و رغبت، کتنی بڑی قربانی کے لئے تیار ہوگیا - آپکی عمر زیادہ ہوچکی تھی اور اولاد کوئی نہ تھی - آپکی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا ہوا - اور ایک فرزندِ سعید و ارجمند کی بشارت ملی - ان منّتوں اور دعاؤں کا بچہ، اور وہ بھی بڑھاپے کی

عمر میں۔ جتنا قدر بھی پیارا ہو کم ہے۔ بچہ بڑھا۔ پھولا۔ پھلا۔ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تو خواب میں اشارہ ملا کہ بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جائے۔ کہنے کو تو یہ حکم دو لفظوں میں ادا ہو گیا۔ لیکن

دلِ صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے!

بال بچوں والے ذرا کلیجہ تھام کر سوچیں تو سہی کہ اس حکم کی تعمیل میں کتنی قیامتیں پوشیدہ تھیں۔ ایسا اللہ آمین کا بچہ۔ برابر کا جوان بیٹا۔ عصائے پیری۔ تمام زندگی کی امیدوں کا ایک ہی آسرا، اور اُسے اپنے ہاتھوں ذبح کر دیا جائے! لیکن پریت کی ریت نیاری ہے۔ دیارِ محبت کے قانون اس دنیا سے جداگانہ ہیں۔ وہاں تو کچھ بھی اپنا نہیں ہوتا۔ حکم کا اشارہ پایا اور لبیک! اللّٰھُمَّ لبیک!! کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ بیٹے کو ساتھ لیکر نکلے۔ راستہ میں پوچھا۔ اے بیٹا! "اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ۔ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی" میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے؟ سوال آپ نے سُن لیا اب اس بچے کا جواب بھی سن لیجئے۔ عرض کیا۔ "یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ" اباجان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، بلا تامل کر گذریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائینگے

سبحان اللہ۔ باپ تو ان ارادوں کا باپ۔ اور بیٹا تو اس حوصلے کا بیٹا۔ باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا چھری ہاتھ میں لی۔ باپ نے اپنی محبت کے تمام جذبات اور بیٹے نے اپنی جان اور جوانی کو محبوبِ حقیقی کے ایک اشارے پر قربانگاہِ عشق میں بلا تکلف بھینٹ کے لئے حاضر کر دیا۔ یہ تسلیم و رضا کی آخری منزل تھی چھری چلنے کو تھی کہ آواز آئی۔

یٰٓاِبْرٰھِیْمُ۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا۔ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ ۝ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝

"صد مرحبا اے ابراہیم (تو نے تو کمال کر دیا) بیشک تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم مخلص بندوں کو اسی طرح اپنی رحمت سے نوازا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ امتحان بہت بڑا تھا (جس میں تو پورا اترا ہے) ہم اس کے بدلے میں تمہیں ایک بہت بڑی قربانی دیتے ہیں

جو قیامت تک یادگار رہیگی ۔ درود وسلام ہو ابراہیم پر ۔ ہم اپنے مخلص بندوں کو ایسا ہی اجر دیا کرتے ہیں ۔"

اس عظیم الشان صحرائی قربانگاہ کی مقدس زمین کو اللہ نے "اپنا گھر" بنانے کے لئے منتخب فرمایا اور دنیا کے تمام توحید پرستوں کو حکم دیدیا کہ وہ اسے اپنی نمازوں کا قبلہ ۔ اپنی آرزوؤں کا کعبہ اور اپنی اجتماعی زندگی کا مرکز قرار دیں ۔ دنیا کے ہر حصہ سے چلکر یہاں پہنچیں اور اس واقعہ عظیمہ کی یاد میں ہر سال تسلیم و رضا اور اطاعت و ایثار کے پیماں کو تازہ کریں ۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ اجتماع ہوتا ہے اور یہ ہے وہ واقعہ جسکی یاد میں قربانی کے جانور اللہ کے نام پر ذبح کئے جاتے ہیں ۔ قربانی کے جانوروں کے متعلق فرمایا کہ ۔

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝

(ان جانوروں میں ایک وقتِ مقررہ تک تمہارے لئے (طرح طرح کے) فائدے ہیں ۔ پھر اس خانۂ قدیم تک پہنچاکر انکی قربانی کرنی ہے)

اس قربانی سے مقصد یہ ہے کہ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۝ قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے محتاجوں کو بھی کھلاؤ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم یونہی جانوروں کا خون بہاؤ ۔ اور نذر کے طور پر ذبح کرکے انہیں گڑھوں میں دبادو ۔ بلکہ مقصد یہ ہے، کہ یہ قربانیاں اللہ کے اُن مہمانوں کی ۔ جو اس تقریب پر اللہ کے گھر میں جمع ہوئے ہیں ۔ اور محتاجوں اور مسکینوں کی غذا کا کام دیں ۔ پھر ان واضح احکامات کے بعد، کھلے کھلے الفاظ میں یہ بھی بتادیا کہ یاد رکھو! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ کو تمہارے ان چڑھاؤں کی ضرورت ہے ۔ وہ اس خونریزی سے خوش ہوتا ہے! یا محض اس رسم کی ادائیگی سے تم اُس کے مقرب بن سکتے ہو ۔ ہرگز نہیں ۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ

"یاد رکھو ۔ اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون ۔ اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے

وہ تو صرف تمہارا تقوےٰ ہے ۔ (یعنی اس کے احکام کی پابندی میں تمہاری خواہشات وجذبات کی قربانی) باقی رہا یہ کہ اُس نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (کہ تم ان سے فائدے حاصل کرو اور کام لو) تو یہ اس لئے نہیں کہ تم اپنے آپ کو بڑی قوتوں کا مالک سمجھنے لگ جاؤ ۔ اور سرکشی اختیار کر لو ۔ بلکہ اس لئے کہ تم اللہ کے نام کی بڑائی کا آواز بلند کرو ۔ یقیناً اس میں اس کے مخلص بندوں کے لئے (بہترین نتائج کی) خوشخبری ہے"

یہ ہے قربانی کی اصل اور یہ ہے اسکی رُوح ۔ یہ ہے اسکی غائیت ۔ اور یہ ہے اس سے مقصود کہ اس رسم کی ادائیگی سے یہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے کہ اگر اس کا حکم ہو تو حضرت خلیل اکبر اور جناب ذبیح اللہ علیہما السلام کی طرح اولاد اور اپنی جان جیسی عزیز چیزیں بھی اُس کی راہ میں بلا تامل قربان کر دی جائیں ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر ایک مسلمان صحیح معنوں میں عَبْدِ مُسْلِمٌ بنتا ہے "بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ" ہاں! جس نے اپنے تمام ارادوں اور خواہشوں کو اللہ کے حکم کے تابع کر دیا ۔ وہی مسلمان ہے ۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

قربانی ہمیں یہی سکھاتی ہے ۔ کہ ہم مسلمان کیسے بنا جاتا ہے ۔ آپ سب کو عید مبارک ہو ۔

پردیسی

عید الضحیٰ کیوں منائی جاتی ہے

(علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

عید اضحیٰ حج کے سلسلہ میں منائی جاتی ہے۔ ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں جو مکہ سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہے حج کا اجتماع ہوتا ہے۔ وہاں سے سورج ڈوبنے کے وقت حاجیوں کا قافلہ روانہ ہوکر رات کو مزدلفہ میں آکر ٹھیرتا ہے۔ اور اگلے روز وہ مزدلفہ سے منیٰ کے مقام میں آجاتا ہے جو مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں حاجی لوگ حج کے فریضہ کو ادا کر لینے کی خوشی میں ابراہیمی رسم کو تازہ کرتے ہیں اور تین دن تک اللہ کے نام پر قربانیاں کرکے خود بھی کھاتے ہیں اور اپنے دوستوں اور غریب اور محتاج بھائیوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ اس حج کے ادا ہونے کے شکریہ میں ساری دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی ملک میں بستے ہوں اور کسی قوم کے ہوں عید کا دوگانہ پڑھتے ہیں اور اپنے ان بھائیوں کی خوشی میں جنہوں نے بیت اللہ پہونچکر حج ادا کیا ہے شرکت کرتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حج کیا ہے اور اسکی اہمیت اسلام میں اسقدر کیوں ہے کہ اسکی ادائیگی پر ساری امت عید مناتی ہے، شکریہ کا دوگانہ پڑھتی اور اس کے نام پر قربانیاں کرتی ہے

یہ تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ کلمۂ توحید۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج۔ اور ہر ہر رکن ایک ایک خاص مقصد کے لئے ہے۔ ان میں سے ملت اسلامیہ کی "اجتماعی ترقی اور اصلاح" حج سے تعلق رکھتی ہے۔ دراصل یہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا سالانہ بین الاقوامی اجتماع ہے جس میں آپس میں مل جلکر ہر قسم کے دینی۔ دنیاوی۔ علمی اور عقلی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اور ملت میں جو جو خرابیاں واقع ہوں انکی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

اس کا مرکز بیت اللہ یعنے کعبہ ہے جو شہر مکہ میں ہے اور جسکی بنیاد خالص توحید یعنی اکیلے اللہ کی پرستش پر رکھی گئی ہے۔ اور جس کی طرف تمام دنیا کے مسلمان رخ کر کے اپنی نمازیں پڑھتے ہیں۔ اس توحید کے گھر کو اللہ نے یہ خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں پہونچکر مسلمان کے دل میں اللہ کا ایسا ڈر پیدا ہوتا ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہاں جو کچھ وہ کہیگا یا کریگا اسکی بنیاد نیک نیتی پر ہو گی۔

کعبہ کی تعمیر اور حج کا تاریخی تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہدے سے ہے جنکو گزرے ہوئے آج کم و بیش چار ہزار سال کا زمانہ ہوا۔ انکو اللہ نے جب توحید کی روشنی بخشی اور اپنا رسول بنایا اس وقت انکے گھر۔ کنبہ اور بستی کے لوگوں نے انکی مخالفت کی۔ یہانتک کہ انکی دشمنی سے تنگ آکر انہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ۔ خاندان اور وطن کو چھوڑ دیا۔ وہ جسوقت حجاز کے اس بنجر حصہ میں اپنے بیٹے اسماعیل کو ساتھ لیکر آئے اس وقت اللہ کے حکم سے ان دونوں باپ بیٹوں نے دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے کعبہ تعمیر کیا۔ یہی دنیا میں موحدوں کی یعنے اکیلے اللہ کے ماننے والوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے انکی دعائیں قبول کیں۔ اور اس گھر کو بڑی برکت دی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ اپنے فائدونکی خاطر حج کے لئے آیا کریں۔

اس اعلان کے بعد حج شروع ہوا۔ اور عرب کے باشندے یہاں سالانہ حج کے لئے آنے لگے۔ اور یہی ان کا سب سے بڑا دینی اور قومی تیوہار ہو گیا جس میں تمام قبیلوں کے رؤسا بھی آکر شریک ہوتے تھے۔ اگر کوئی نہیں آسکتا تھا تو اپنا قائم مقام بھیجدیتا تھا۔ کیونکہ اسی موقع پر اس کے سارے قومی معاملے مثلاً قبیلوں کے جھگڑے۔ باہمی خونوں کے مقدمے اور سرداری کے تنازعے وغیرہ چکائے جاتے تھے۔ علاوہ بریں خرید و فروخت اور تجارت کی بھی گرم بازاری رہتی تھی۔ آخر میں صدیوں پر صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس میں بہت سی خرابیاں پڑ گئی تھیں۔ کیونکہ حج عرب کے باشندے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کی رہنمائی میں کرتے تھے جو مکہ میں کعبہ کی مجاور تھی اور قریش کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ یہ لوگ دین کی حقیقت سے ناواقف ہو گئے تھے اور اَن پڑھ تھے۔ انہوں نے اس حج کو جس کی بنیاد اکیلے اللہ کی

پرستش پر تھی مشرکانہ رسموں کا مجموعہ بنا لیا تھا اور کعبہ میں جو توحید کا گھر تھا سینکڑوں بت لاکر رکھدئے تھے جنکی پوجا ہوتی تھی۔ جب قریش کے گھرانے میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اور اللہ نے انکو اپنا سب سے آخری اور سارے جہاں کے لئے رسول بنایا۔ تو انکی امت پر بھی حج فرض کر دیا۔ یعنے ہر مسلمان پر جو مکہ تک جانے آنے کی طاقت رکھتا ہو زندگی میں ایک بار حج کرنا لازم ہے۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے پھر اس حج کو شرک کی رسموں سے پاک کر کے اسکی اصلی شکل میں قائم کیا۔ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں عہد ابراہیمی و اسماعیلی کے بعد صحیح طریقہ سے یہ فریضہ ادا کیا گیا۔ اس حج میں امیر حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اور نقیب حضرت علیؓ۔ دوسرے سال یعنے ۱۰ھ میں خود حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے حج ادا کیا جس میں تقریباً سوا لاکھ مسلمان شریک تھے۔

یہ رکن یعنے حج چونکہ اسلام اور ملت کے ہر طرح کے اجتماعی فائدوں کے لئے ہے اس لئے اسکی بہت بڑی دینی اہمیت ہے۔ سال کا ایک چوتھائی حصہ یعنے شوال۔ ذی قعدہ۔ اور ذالحجہ تین مہینے اسکے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ حج کی نیت کرنے والے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جائیں۔ نہ لڑیں۔ نہ جھگڑیں نہ بدزبانی کریں۔ اور کعبہ پہونچنے سے سینکڑوں میل پہلے ہی سے مقررہ میقاتوں یعنے مقاموں سے مرد بے سلا ہوا جامۂ احرام پہن لیں۔ ایک لنگی اوپر اور ایک لنگی نیچے تاکہ امیر و غریب آقا و غلام اور شاہ و گدا کا فرق باقی نہ رہے۔ اور سب برابر کے بھائی ہو کر اسی ایک لباس میں لبیک لبیک یعنے حاضر حاضر پکارتے اپنے مالک کے آستانہ میں آن موجود ہوں۔

وہاں سب سے پہلا کام جس سے حج شروع کیا جاتا ہے یہ ہے کہ سات بار کعبہ کے ارد گرد طواف کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسکی توحید پر جس کی عبادت کے لئے یہ گھر بنایا گیا ہے نثار کرتے ہیں کہ اگر جان بھی دینی پڑیگی تو اس سے نہیں پلٹینگے۔

طواف کے بعد حج کے دوسرے فرائض مکہ ہی میں ادا کئے جاتے ہیں۔ ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو حاجیوں کا قافلہ مکہ سے روانہ ہوتا ہے۔ ۹ تاریخ کو عرفات کے میدان میں سب جاکر جمع ہو جاتے ہیں اسی اجتماع کا نام حج ہے۔

حج کی ایک بڑی غرض یہ ہے کہ دنیا کی مسلمان قوموں کے نمائندے جو وہاں پہونچیں آپس میں ملکر باہمی تعلقات پیدا کریں اور انکو یہ علم ہو جائے کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کی کیا مدد کر سکتے ہیں یا ان سے کیا مدد لے سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ خلفاء و امراء ملکی اور انتظامی معاملات میں باہم مشورے کریں۔ اور رعایا کی شکایتیں۔ ضرورتیں اور خواہشیں انکو معلوم ہوں۔ اس لئے حج میں ملکی۔ ملی دینی اور دنیاوی ہر طرح کے فائدے ہیں۔ جبتک اسلامی حکومت قرآن کے مطابق تھی صوبوں کے حکام حج کے موقع پر مکہ میں آتے تھے اور اکثر خلیفۂ وقت امیرالحج ہوتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے وہ نہیں آسکتا تھا تو کسیکو قائم مقام بناکر بھیجتا تھا۔ الغرض حج مسلمانوں کا سب سے بڑا ملی اور دینی اجتماع ہے جس میں دنیا کی چاروں سمتوں سے ہر قوم کے مسلمان دور دراز ملکوں سے جنگل، بیابان کوہ اور دریا طے کرتے ہوئے مکہ میں آکر جمع ہوتے ہیں جنکی نیت خالص یہی ہوتی ہے کہ اللہ کی توحید کے کلمہ کو بلند کریں۔ اس لئے تمام دنیا کے مسلمانوں کی نگاہیں اپنے ان نمائندوں کی طرف لگی رہتی ہیں کہ وہ توحید کی سربلندی اور ملت کی بہتری کے لئے کیا کیا سوچتے اور کیا کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ جماعت حج سے فارغ ہوکر دس تاریخ کو یعنے آج کے دن منیٰ کے مقام میں آکر حج ادا کرنے کی خوشی مناتی ہے تو ساری دنیا کے مسلمان اس خوشی میں انکے ساتھ شرکت کرنے کے لئے اپنے اپنے ملکوں اور اپنی اپنی بستیوں میں عید مناتے۔ شکریہ کا دوگانہ پڑھتے اور قربانیاں کرکے کھاتے اور کھلاتے ہیں جس سے اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ حاجیوں نے حج کا اجتماعی فریضہ جو ادا کیا ہے اسمیں تمام ملت انکے ساتھ ہے۔

ایک مدت سے جس طرح مسلمانوں کے دوسرے دینی کام بے روح اور بے جان ہیں اور محض رسمی طور پر آخرت کے ثواب کی غرض سے کئے جاتے ہیں اور دنیاوی فائدوں سے خالی ہوگئے ہیں وہی حال حج کا بھی ہے لیکن باوجود اسکے مسلمانوں نے مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت زمانوں میں بھی اسکو جاری رکھا ہے اور برابر ادا کرتے چلے آتے ہیں۔ اسلئے امید ہے کہ اللہ پھر انکے کاموں میں جان ڈالدیگا۔ اور وہ صحیح معنوں میں حج ادا کرنے لگینگے۔

آخر میں میں اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کو عید کی مبارکباد دیتا ہوں اور اللہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اسلام کے ارکان کی حقیقتوں کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اللہ ہم سب کے ساتھ ہو۔

ہمارا تعلیمی نظام

(۱) کالج

تاریخ عالم کے قدیم دور میں نظر آتا ہے کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں زیر دست اقوام کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قتل و غارت اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی تھیں۔ چنگیز خاںؒ اور ہلاکو خاںؒ کی خونچکاں داستانیں صفحات تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود۔ شدّاد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس دور میں محکوم افراد کی جان و مال، ان کی عورتوں کی عصمت و عفّت، سب کی سب ان ظالم و مستبد حکمران طاقتوں کی ہوس رانیوں کی تسکین کا موجب ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے محکوم انسانوں سے حیوانوں کا کام لیا۔ کمزور و ناتواں انسانوں کے خون کی رنگینیاں قوت و ثروت کے مالک انسانوں کے ایوانوں کی تزئین و آرائش کا کام دیتی تھیں۔ وہ جس طرح سے چاہتے ان کمزور و بے دست پا انسانوں کو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیتے۔ یہاں تک کہ اس دور میں ایک معمولی مزدور سے لیکر حریر و اطلس میں ملبوس خادمہ تک سے جو شاہی محلات میں زندگی بسر کرتی تھی ایک ہی کام لیا جاتا تھا یعنی ان کی حیثیت یہی تھی کہ قوّتِ حاکمہ کے ارادوں اور خواہشات کی تکمیل میں مختلف پرزوں کا کام دیں۔ غلام قوم کے مرد و زن ہر وقت حکمرانوں کے اشارۂ ابرو کے منتظر پائے جاتے تھے۔ وہ ان سے جو خدمت چاہتے لیتے تھے۔

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد　　آبروئے دخترِ مزدور برد

در حضورش بندہ می نالد چو نے　　بہ لب او نالہ ہائے پے بہ پے

غلام کا فریضہ تھا کہ وہ گاڑھا پسینہ بہا کر حکمراں طاقت کے لئے ضروریات زندگی مہیا کرے خود فقر و فاقہ برداشت کرے لیکن اس کے مالک کے عیش میں ذرا بھر بھی فرق نہ آنے پائے۔ وہ جامۂ تار تار زیبِ تن کرے لیکن اس کا آقا حریر و پرنیاں میں ملبوس نظر آئے۔ اگر وہ کام میں ذرا بھی سستی کرے تو حکومت کے

کارندے کوڑوں اور تازیانوں سے اس کی کھال ادھیڑ دیں

بریشم قبائے خواجہ از محنتِ او

نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

اس دور کے انسانوں کی مظلومیت بیکسی اور ذلت کا تصوّر کرتے وقت پیشانی پر شکن پڑ جاتی ہے کہ یا اللہ یہ اس انسان کی حالت ہے جسے تو نے سلطانِ بحر و بر بنایا تھا اور جسے فرشتوں سے بھی افضل قرار دیا تھا!

اس دور میں یہ سب کچھ تھا لیکن بایں ہمہ یہ صاف نظر آجائے گا کہ وہاں زیر دست کو اپنی مظلومیت، غلاموں کو اپنی غلامی اور محکوم کو اپنی محکومیت کی ذلّت کا احساس تھا اور وہ ہمیشہ اس کوشش اور خواہش میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس طوقِ لعنت کو گلے سے اتار پھینکیں۔ وہ دورِ جہالت تھا۔ علانیہ سبعیت اور بربریت کا زمانہ تھا۔ عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو رحمت و برکت کا زمانہ سمجھتا ہے جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جس سے انسانیت تڑپتی، بلکتی اور پھڑکتی نظر آئے۔ وہ اپنے نظامِ حکومت کو آئین و جمہوریت کا دور کہتا ہے۔ اپنے آپ کو اخوت، حریت اور مساوات کا علمبردار سمجھتا ہے۔ لیکن جو لوگ حقائقِ اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہدِ جاہلیت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ عہدِ جاہلیت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ ظلم و استبداد کو کس طرح خوشنما نقابوں میں چھپا کر انسانیت کو تختۂ مشق بنایا جا سکتا ہے۔ وہ جہاں قتل و غارت کرتا تھا علانیہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب محکوم قوموں کو لوٹنا چاہتا تھا تو ان کے اموال ضبط کر لیتا تھا وہ جب ان سے اپنی خدمت لینا چاہتا تھا تو بوجھ سنگین لیتا تھا وہ جو کچھ بھی کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن اس دور میں عقلِ انسانی کافی ترقی کر چکی ہے یہ

اب اس دورِ جاہلیت کی طرح اپنی ہوسِ خون آشامی کو کھلم کھلا پورا کرنے کو حماقت سمجھتا ہے۔ برعکس اس کے اس نے اپنی اس ہوسِ ستم رانی اور ظلم کوشی کو پورا کرنے کے ایسے طریقے ایجاد کر لئے ہیں کہ محکوم قوموں کو پتہ تک بھی نہیں لگنے دیا جاتا پھر لطف یہ کہ دورِ جاہلیت میں غلام و محکوم اپنی ذلت کو محسوس کرتا تھا لیکن یہاں پر اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اس عیاری اور شعبدہ کاری سے یہ سب کچھ حاصل کیا جاتا ہے کہ محکوم اقوام کو پتہ تک نہیں لگتا اور وہ سب کچھ لٹوا بیٹھتی ہیں۔

میر و سلطاں نرد باز و کعبتین شاں دغل

جانِ محکوماں زتن بردند و محکوماں بخواب!

انقلاب! انقلاب اے انقلاب

عصرِ حاضر کے محکوم انسان سے وہی کچھ کرایا جاتا ہے جو دورِ جاہلیت میں کرایا جاتا تھا لیکن انداز اس قدر مشفقانہ رکھا جاتا ہے کہ اس کے دل میں حاکم کے خلاف نفرت کا جذبہ تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی ذہنیت ہی ایسی بنا دی جاتی ہے کہ وہ ان باتوں کو قطعاً خلافِ ضمیر نہیں سمجھ سکتا آج معاشی نظام ہی اس نہج پر قائم کیا جاتا ہے کہ محکوم اقوام اس نظام میں ایک پرزے کی طرح کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور اس طرح سے ان کی غیرت فنا ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ جابر حکومتوں کا طرزِ عمل دورِ وحشت کے مقابلہ میں زیادہ مہلک اور خطرناک ہے۔

کشتنِ بے حرب و ضرب آئین اوست

مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست!

آج یہ سب کچھ اس حربہ سے حاصل کیا جاتا ہے جسے تعلیم کے حسین و جاذبِ نگاہ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مدنیتِ فرنگ | اہلِ فرنگ کا نظامِ تعلیم ان کے تمدن کا آئینہ دار ہے۔ جیسے ان کا تمدن غیر مستقیم

ویسے ہی نظامِ تعلیم بھی غیر مستقیم۔ اس تمدّن میں جتنی خرابیاں موجود تھیں وہ اس نظامِ تعلیم میں جلوہ گر ہوئیں۔ فرنگیوں کے تمدّن کی بنیاد یکسر مادیت پر ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا تصور یہ ہے کہ اسے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اس کی ساری عمارت خدا کے انکار پر قائم ہے۔ وہ عقل فسوں پیشہ کی اتباع میں زندگی کے تمام مسائل کو مادی نقطۂ نگاہ سے حل کرتا ہے۔ اس کے نزدیک جلبِ منفعت کے لئے ہر ممکن حیلہ کو بروئے کار لانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ نظامِ اخلاق سارے کا سارا انسانی خواہشات کے تابع ہے۔ اس نے انسان اور انسان میں نسل۔ قومیت۔ رنگ۔ زبان اور جغرافیائی حدود کی بنا پر اختلاف کی خلیج حائل کر دی ہے۔ اس کا سارا معاشی نظام سُود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اس کا بنا کردہ نظامِ سیاست تمام کا تمام انسانوں کا وضع کردہ ہے جس میں نت نئے تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس تمدّن میں عہد شکنی۔ دھوکہ بازی۔ اور دروغ بافی کو آئینِ سیاست سمجھا جاتا ہے۔ مکافاتِ عمل کا تصور یہاں پرنا پید ہے اس لئے خیر و شر کے متعلق کوئی قوانین نہیں ہیں۔ القصّہ زندگی کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس قسم کا تمدن دنیا کی کسی اور قوم کے لئے سازگار آئے تو آئے مسلمانوں کے لئے تو زہرِ ہلاہل کے مرادف ہے۔ اسلام کے بنیادی اصول سے اس کا بعد المشرقین ہے اس کے زاویۂ نگاہ اور اسلام کے زاویۂ نگاہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ان میں یہاں تک تضاد موجود ہے کہ جو چیز اہلِ فرنگ کے لئے زندگی ہے وہ مسلمان کے لئے موت ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے کا سارا نظام اسلامی تہذیب و ثقافت کے خلاف ایک گہری سازش ہے۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

مسلمان کا نظریہ تمدّن

مسلمان کی زندگی کی بنیاد ہی عقیدۂ توحید پر ہے اور یہاں خواہشات کو خدا بنایا گیا ہے۔ اسلام کا پورا نظام وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے۔ اہلِ فرنگ کے نظریہ کے مطابق وحی کی حقیقت ہی میں ریب و تشکک اور رسالت کے من جانب اللہ ہونے میں شبہ ہے۔ اخلاقیات میں مسلمان کے پیشِ نظر قانونِ خداوندی کی پابندی اور حدود اللہ کی نگہداشت ہے اور مغرب کے پیشِ نظر محض ذاتی اغراض، یہاں تک کہ اجتماعی مسائل میں دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ اسلام کے پیشِ نظر اتحادِ انسانیت ہے اور اہلِ فرنگ کے پیشِ نظر افتراقِ انسانیت۔ اسلام تمام انسانوں کو خدا کی حاکمیت میں

لاتا ہے اور فرنگی تمدن انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت مسلط کرنا چاہتا ہے۔

اسلام اور فرنگی تمدّن ایک جگہ پر زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ جہاں پر افرنگی تمدن ہوگا وہاں اسلام اس وقت تک جگہ نہیں لے سکتا جب تک کہ اس تمدن کا کلیتہ استیصال نہ کر دیا جائے۔ اور تمام اقتدار اسلام کے ہاتھ میں نہ آجائے۔

جو نظامِ تعلیم افرنگی تمدن کے زیر سایہ پرورش پائے گا۔ اس میں رُوح اسلامی کی کیا حالت ہوگی؟ اسلامی تمدن اور فرنگی تمدن کے اس واضح اختلاف کے بعد یہ بات محتاج تشریح نہیں رہتی۔

موجُودہ نظامِ تعلیم

ہندوستان میں جب موجودہ مغربی حکومت کا اقتدار قائم ہوا تو دانشمندانِ فرنگ نے فوراً اس راز کو پالیا کہ۔

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

۱۸۳۹ء میں جب لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کے لئے تعلیمی نظام مرتب کر کے پیش کیا تو اس پر اعتراض کیا گیا کہ اس طرح سے حکومت کے مفاد کو نقصان پہنچے گا تو معززین کو یہ جواب دے کر مطمئن کر دیا گیا کہ "اس تعلیمی نظام پر عمل پیرا ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد ہندوستانی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن خیالات۔ رجحانات۔ تہذیب اور معاشرت کے لحاظ سے یکسر فرنگی ہوگی"۔

یہ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے مخصوص تمدّن کو کھو بیٹھتی ہے تو وہ ایسا جسم بن کے رہ جاتی ہے جس سے رُوح پرواز کر چکی ہو۔ ۱۸۳۹ء میں اس نظام تعلیم کو رائج کر دیا گیا اور ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہسٹنگز نے اعلان کر دیا کہ ملازمت میں اسے ترجیح دی جائے گی جو انگریزی جانتا ہو۔ اس نظامِ تعلیم سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا جن کے مدارس کی اہمیت خاک میں مل گئی ہندوؤں کا کوئی مخصوص تمدّن نہ تھا اس لئے انگریزی تمدن کو اختیار کرتے وقت انہیں اپنی مخصوص روایات کے فنا ہونے کا کوئی

خیال نہیں آیا مسلمان دنیا سے پہلے ہی کورا تھا اب دین بھی گیا۔ اور وہ مسلمان جنھوں نے اس براعظم میں ایک ہزار سال تک کُوسُ لمن الملک الیوم بجایا تھا سیاسی اور اقتصادی دونو اعتبار سے ذلیل ہو گئے۔ اور اس تعلیم کے نفاذ کے بعد ان کی جو حالت تھی وہ ناگفتہ بہ تھی۔ سارے ملک میں انتشار ذہنی رونما ہو چکا تھا مسلمان انگریزی تعلیم میں اپنے دین کا خسارا دیکھتے تھے ادھر افلاس تھا جو قومی زندگی کی رمقِ جان تک کو چوس رہا تھا۔ تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ چار و ناچار کافی عرصہ کے بعد جبکہ مسلمان پر معاش کے سب دروازے بند ہو چکے تھے مترا کیا نہ کرتا۔ آخر انہیں اس نظام تعلیم کو قبول کرنا ہی پڑا اور بقول ڈاکٹر ہنٹر (Dr. Hunter ـــــ) "اس طرح بتدریج اسلامی ہندوستان کو دارالحرب بنا دیا گیا اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت ہو کر رہ گئی" (Indian Musalmans)

اس نظامِ تعلیم کی خرابیاں

اس نظامِ تعلیم میں پوری طرح سے فرنگی تمدن کی رُوح کو بھر دیا گیا تھا مسلمانوں کے لئے اس میں کوئی چیز بھی مفید نہ تھی۔ اب اس تمدن نے جو کہ ایک حاکم قوم کے تمدن کی حیثیت میں ذہنی غلبہ و استیلاء کا دعویدار تھا اپنا کام کرنا شروع کیا مسلمان پہلے ہی بے دست پا تھا تھوڑی مدت تک اسے نفرت کی نظر سے دیکھا لیکن رفتہ رفتہ اس تہذیب و تمدّن کی رُوح نے اپنا کام کرنا شروع کیا اور وہی مسلمان جو نفرت کے جذبات لیکر اس تمدن کے مطالعہ کے لئے بڑھا تھا اپنے تمدن سے بیگانہ ہونے لگا۔ کیونکہ سارے نظامِ تعلیم میں کوئی جزو بھی ایسی نہ تھی جو اس زہر کے لئے تریاق کا کام کرتی۔ مذہب۔ خدا۔ اور معاملات زندگی کے متعلق جو نظریہ اس نظامِ تعلیم میں پیش کیا گیا تھا عقل و خرد کی فسوں کاری سے ایسا خوشنما اور جاذب نظر تھا کہ بلا تکلف ان نوجوانوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور ایمان کی آواز نے رخصت ہوتے وقت کہا تو یہی کہا ؎

مکدّر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را	جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی
دلِ گیتی۔ انا المسموم انا المسموم فریادش	خرد نالاں کہ لا عندی بتریاق و لا راقی)

رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ اس تعلیم سے جو نوجوان فارغ ہو کر نکلے انہوں نے اسلام کے خلاف باغیانہ خیالات پھیلانے شروع کئے ۔ کہ اسلام تنگ نظری سکھاتا ہے ۔ اس میں تقدیر کے عقیدہ نے قوائے عملیہ کو شل کر دیا ہے ۔ اس کے اصول عقل کے خلاف ہیں وغیرہ وغیرہ ٹھیک گراموفون کے ریکارڈ کی طرح کہ جو کچھ اس پر ریکارڈ کیا جاتا ہے وہی سنائی دیتا ہے ۔ لیکن ان بچاروں پر افسوس آتا ہے کہ انگریزی تعلیم سے انہوں نے صرف ظاہری چمک دیکھی اور اس سے اس قدر مسحور ہوئے کہ اسکی اندرونی خرابیوں کا اندازہ تک نہ کر سکے ۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی برّاقی

اسے اس زہر کا علم نہ تھا جو آہستہ آہستہ اس کے حلق میں ٹپکایا جا رہا تھا اور خود فراموشی کی افیون سے بیہوش کر کے اسے اپنی تہذیب ۔ اپنے تمدّن ۔ اور اپنی قومی روایات سے قطعاً بیگانہ بنا کر اینگلو محمڈن بنایا جا رہا تھا تاکہ وہ اقتدارِ حاکمیت کے بت کے سامنے تا ابد سجدہ ریز رہے ۔ اسے اپنے طرز معاشرت سے متنفر کیا جا رہا تھا کہ مغربی مصنوعات کے استعمال کے عشق میں اپنی مصنوعات کا خیال تک نہ کرے ۔ حکومت نے تعلیم اس غرض سے نہیں دی تھی کہ ہندوستانی حریت فکر کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنے ملک کو اغیار کی دستبرد سے بچانے کے لئے کوشاں رہیں بلکہ اس کا مقصد تو اپنی حکومت کی مشینری کے لئے پرزے تیار کرنا تھا اگر یہ پرزے وہ ولایت سے لاسکتا تو اسے یہ دقت نہ اٹھانی پڑتی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا ۔ نیز اسے یہاں کے کل پرزوں سے یہ فائدہ بھی ملحوظ تھا کہ ہندوستانی انہیں اپنا سمجھکر ان کے افکار و خیالات سے زیادہ متاثر ہوں گے اور ساری کی ساری آبادی مادی استیلاء کے ساتھ ساتھ ذہنی استیلاء کو بھی تسلیم کر لے گی اور جب ذہنی غلامی پیدا ہو گئی تو حکومت کا اقتدار زیادہ پائیدار ہو جائے گا ۔ اور ادھر مکتب کا جوان گرم خون "ساحر افرنگ کا صید زبون ہونے کے باوجود اپنے اذ نگیت مآب ہونے پر فخر کر رہا ہے ۔ اسے اس بات کا علم نہیں کہ مغربی تمدّن کے استیلاء کا راز کس عمل میں مضمر ہے ۔ اور نہ ہی اس کا دھیان ہے کہ اس کی اپنی قوم کن وجوہات کی بناء پر زوال پذیر ہوئی ۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ !

والدین نے اپنے بیٹے کو ان نئے مدارس میں اس لئے بھیجا کہ وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی قوم کی تیرہ بختی کا مداوا کرے گا۔ لیکن اس تعلیم کے حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی قوم کو ختم کرنے پر ہی کمر باندھی۔ یورپ کے نظریات سیاست و تمدّن کے پڑھنے کے بعد اس نے مذہب کو جو کہ اس کی قوم کی بنا تھا بالکل اڑا دیا اور دوسری قوم کے ساتھ جو تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے بالکل غیر تھی متحدہ قومیت بنانے کے ارادہ پر ڈٹ گیا۔ اسلامی سوسائٹی کا تصور اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ اسلام اور اس کے احکام کو نعوذ باللہ فضولیات سمجھتے ہوئے مذہب کو زندگی کا ایک پرائیویٹ معاملہ سمجھتا ہے۔ وہ اسلام کو بھی انہیں معنوں میں مذہب تصور کرتا ہے جن معنوں میں کہ اس کے استادانِ تہذیب نے اسے بتایا ہے اس کے لئے افرنگ کے نظریاتِ سیاست و معاشرت زیادہ جاذب نظر ہیں۔ وہ اسلام کے نظامِ سیاست سے غافل ہو کر یورپ کے سیاسی اصولوں کا پرستار بنا جا رہا ہے۔ اس نوجوان کے والدین کو معلوم ہو کہ اس قسم کا انقلابِ ذہنیت تو ایک شدنی بات تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اس نے جس قسم کا لٹریچر پڑھا منطقی طور پر ویسے ہی افکار حاصل کئے۔ جب مغرب کی رُوح تمدّن ایسی ہے تو عام طور پر یہ توقع رکھنا کہ انگریزی تعلیم کے بعد بھی لڑکا مسلمان رہے گا بالکل طفلانہ خیال ہے جب تہذیبِ فرنگ نے اس کے دل و دماغ کو بالکل بدل دیا ہے تو اسلام کی خدمت نہ کرنے کا شکوہ بیجا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اس نظامِ تعلیم میں ابجد خوانی سے لیکر تکمیل تعلیم تک کہیں بھی خدا پر اعتقاد کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ بلکہ ابتدا سے لیکر انتہا تک یہی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الوسع اس قسم کا خیال تک نہ آئے۔ اگر حالت صرف یہاں تک رہتی تو بھی شکوہ نہ تھا۔ انگلش لٹریچر کے درجہ تکمیل یعنی ایم۔ اے میں نہایت ہی صاف۔ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں منکرین خدا شعرا کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ بلکہ رجحان ہی ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ انسان

اس قسم کے خیالات کو خلافِ عقل بلکہ فرسودہ سمجھ کر بالکل ٹھکرا دے ۔ میں ایک نوجوان سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور اسے کوئی سات آٹھ سال سے جانتا ہوں ۔ اس کی زندگی اسلامی تھی ۔ قرآن حکیم کی تلاوت بھی کرتا تھا ۔ حضرت علامہ اقبال مرحوم کے کلام پر بھی اسے عبور حاصل تھا اور کئی دفعہ اسلامی تہذیب و ثقافت پر جب ہمارا تبادلۂ خیالات ہوتا تو میں اسے ایک سمجھدار مسلمان خیال کیا کرتا ۔ اس نے ایم ۔ اے میں انگریزی کو بطور مضمون کے لیا ۔ ایک سال کے اندر ہی اندر اس کے خیالات ۔ رجحانات میں غیر معمولی انقلابات آنے لگ گئے ۔ وہ کبھی نسل کو وجہِ اشتراک بنانے کے خیال میں پان ایرین خیالات کا اظہار کرتا اور کبھی موجودہ اقتصادی بدحالی کو سوشلزم کے نظام سے حل کرنے کے منصوبے باندھتا ۔ ایک دن اس نے برملا کہدیا کہ ہمیں عرب کے خالدؓ اور فاروقؓ پر فخر کرنے کی کیا ضرورت ہے ہمارے لئے ہندوستان کی تاریخ میں ایسے بے شمار ہیرو موجود ہیں ۔ میں نے ایک مسلمان سے پہلی بار اس قسم کے خیالات سنے تو حیران رہ گیا ۔ اور جب اس سے اس مسئلہ پر بحث ہونے لگی تو وہ کہنے لگا کہ میں (Serious) نہیں تھا ۔ اس کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کہا کہ میں ہندوؤں کے ساتھ سلسلۂ ازدواج (Intermarriage) قائم کرنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتا ۔ یہ اس کی بے ربطی خیالات و افکار کا پہلا مظہر تھا ۔ اس کے بعد کہنے لگا کہ دن بدن توحید سے میرا اعتقاد اٹھتا جا رہا ہے ۔ اس کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے ۔ یہ کس تعلیم کا اثر تھا ؟ اس انگریزی تعلیم کا جس میں شیلے (Shelly) اور کیٹس (Keats) کے دواوین کی بے ضرر تعلیم دیجاتی ہے ! خدا جانے اس قسم کے کتنے نوجوان ہیں جو مصلحتِ وقت کا خیال کرتے ہوئے اس قسم کے زہریلے خیالات کا اظہار نہیں کرتے ۔

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیر یاب
انقلاب ! انقلاب اے انقلاب

ایک اور چیز جو اس نظام تعلیم سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ نوجوان محض نمائش کے طور پر سوشلزم ۔ ہمدردیٔ نوع انسان ۔ آزادی اور خدمتِ قوم کے دعاوی کر کے دوران تعلیم میں بڑے بڑے ارادے ظاہر کرتے ہیں تاکہ سوسائٹی میں ان کی قدر و منزلت بڑھ جائے لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی انہیں یقین نہیں ہوتا ۔ سوشلزم کے حامی نوجوانوں کو سب سے زیادہ مسرف دیکھا جاتا ہے ۔ ہمدردیٔ نوع انسان کے مبلّغ عملی زندگی میں اس کی پرواہ تک نہیں کرتے اور آزادی و خدمتِ قوم کا تمام نشہ فارغ التحصیل ہوتے ہی ہرن ہو جاتا ہے ۔ میں اس خیال کے خلاف ہوں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے لئے مقصدِ حیات متعین کیا جائے اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ دوران تعلیم میں وہ اپنے مقصد سے بے خبر تھا ۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک نوجوان دوران تعلیم میں تو اس قسم کے دعاوی کرتا رہے اور پورے یقین سے ان کی صحت پر ایمان بھی لے آئے لیکن جب میدان عمل میں آئے تو ان خیالات سے کورا ہو جائے ۔ دراصل دوران تعلیم میں ان کے یہ خیالات بہت ناپختہ ہوتے ہیں ۔ وہ مختلف سیاسی ۔ معاشی ۔ معاشرتی اور اخلاقی نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں ان کی تعلیم بھی دی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان میں کسی ایک کو بھی قلب کی گہرائیوں میں محسوس نہیں کر سکتے ۔ اس میں طالب علم کے قلب و دماغ کا قصور نہیں بلکہ نظام تعلیم کا قصور ہے کہ اس میں پہلے درجے کی خود غرضی سکھائی جاتی ہے ۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اس نظام تعلیم کی بدولت طالب علم کی نگاہ بالکل فرنگیانہ ہو جاتی ہے ۔ اس کا طریق فکر ۔ اس کا انداز نگاہ اس کی آرزوئیں ۔ اس کے عزائم اور اس کی تمام تر ذہنی صلاحتیں اسی نہج پر کام کرتی ہیں جس پر فرنگی تمدّن رہنمائی کرتا ہے ۔ وہ اسلامی نظام کو بھی دوسرے دنیاوی نظامات کی طرح زوال پذیر سمجھتے ہیں ۔ کئی دفعہ اس قسم کے طلبہ سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تو وہ یوں گویا ہوئے ۔ کہ دنیا میں کئی تہذیبیں عروج پر پہنچیں اور پھر زوال پذیر ہو گئیں ۔ رومن تہذیب فنا ہو گئی ۔ مصریوں کی شاندار تہذیب کا نام

ونشان تک نہ رہا۔ بابل ونینوا کی تہذیب کے آثار تک نہ رہے۔ ایرانی عربی تہذیب وتمدّن کے سامنے شکست کھا گئی ہندوستان کی پراچین تہذیب ختم ہوگئی اسی طرح اسلامی تہذیب بھی زوال پذیر ہوگئی۔ اگر ایک واقعہ کی حیثیت میں ان خیالات کا اظہار کیا جاتا تو زیادہ خطرناک نہ تھا لیکن اگر یہ نظریہ قائم کیا جائے کہ دنیا میں کوئی نظامِ زندگی بھی قائم و دائم نہیں تو اس وقت اس قسم کے نوجوانوں کی غیر اسلامی ذہنیت پر رونا آتا ہے۔ جن تہذیبوں کا ذکر ہوا یہ فنا ہوگئیں لیکن اسلامی تہذیب کے متعلق کہ وہ فنا ہوگئی خلاف از واقعہ ہے۔ جو تہذیب فنا ہوگئی وہ اسلامی نہ تھی وہ تو سراسر عجمی تہذیب تھی جسے صرف عربی قالب دیا گیا تھا مسلمانوں کی تاریخ کا شاندار زمانہ تو عباسیہ ہی کا ہے۔ اس دور میں کونسی چیز خالص اسلامی تہذیب وتمدن پر قائم تھی۔ خود روحِ خلافت جب استبدادی تھی تو رسوم وظواہر کے اسلامی ہونے سے کوئی تہذیب اسلامی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلامی تہذیب بھی فنا ہوگئی خلاف واقعہ ہے۔ اسلامی تہذیب احکام اسلام کو عملاً دنیا میں نافذ کرنے کا نام ہے۔ ان احکام کے مطابق جو زندگی ہوگی وہی اسلامی تہذیب وتمدن ہے۔ جو زندگی ان احکام کے مطابق نہ ہوگی وہ اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ قرآن حکیم نے کہا تو یہی کہا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً	اے مسلمانو! پورے طور پر اسلامی احکام کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لو۔

یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپ ۹۹ فی صدی مسلمان ہوں اور ایک فیصدی کچھ اور۔ اس لئے اگر بنی اُمیّہ یا بنو عباس کی خلافت کو زوال آیا تو یہ اسلامی تہذیب وتمدّن کا زوال نہیں ہوسکتا بلکہ اس سلطنت کا زوال ہے جو دنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح قائم تھی۔

موجودہ طرزِ تعلیم کے فارغ التحصیل نوجوان اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو کوئی عجب نہیں کیونکہ وہ جس تمدّن کی رُوح کے زیر اثر ہیں وہ خود غیر مستقیم ہے اس میں آئے دن انقلابات آتے رہتے ہیں۔ نظام سیاست میں ہر روز کتر بیونت ہوتی رہتی ہے اسی طرح معاشرت کے تمام مسائل کے متعلق ان

نوجوانوں کا زاویۂ نگاہ بالکل فرنگی ہے۔ وہ شاندار ماضی کا سچا اسلامی اور جس میں انسانیت اپنے مدارج کبریٰ تک پہنچی تھی ان کے نزدیک (معاذ اللہ) تاریکی کا زمانہ تھا جس سے اپنے آپ کو منسوب کرنے سے انہیں عار ہے ؎

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی — چہ نامردانہ در بتخانہ مُردی!

خرد بیگانۂ دل سینہ بے سوز — کہ از تاکِ نیاگاں مے نہ خوردی

اس نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ایمان و یقین کی نعمت سے طالب علم خالی رہتا ہے۔ چونکہ فرنگی تمدّن کی رُوح تاجرانہ ہے۔ اس لئے اس تعلیم میں بھی زندگی کے ہر پہلو کو اسی مادی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ معاشیات کے ایک طالب علم کے ساتھ بڑی دیر تک سود کی حرمت پر میری بحث ہوتی رہی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اگر قرض خواہ اس رقم کو اس عرصہ میں کسی کاروبار پر لگاتا تو اسے کسی قدر منافع ہوتا۔ نیز مقروض نے جب اس رقم سے فائدہ اٹھایا ہے تو قرض خواہ اس فائدہ سے کیوں خالی رہے۔ جب مقروض نے اس نقدی سے اپنی ضروری حاجت پوری کی ہے تو اسے اس کا معاوضہ دینا چاہیئے کیونکہ قرض خواہ اس کی امداد پر مکلّف تو نہ تھا یہ وہ خیالات ہیں جو فرنگی معاشیات کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے اس طالب علم پر جو کہ اسی نظام معاشیات کا مطالعہ کر رہا تھا یہ ننگ انسانیت اثر ضرور پڑتا تھا۔ یورپین تمدّن آج اسی تاجرانہ ذہنیت کی وجہ سے قریب المرگ ہے

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ — سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

اس تمدن کا سارا کاروبار سود پر چل رہا ہے جو لاتعداد فتن و مفاسد کا پیش خیمہ ہے اس سے ع

آدمی درندہ ہے ذندان و چنگ

ان نوجوانوں کی زندگی میں لطیف و پاک جذبات جو احترامِ آدمیت کے لئے پیدا ہوں عام طور پر نہیں مل سکتے۔ ان کا تعلق اپنے اساتذہ سے بھی تاجرانہ طرز کا ہوتا ہے وہ مقدّس تعلقات جو استاد و شاگرد کے درمیان ہونے چاہئیں ان کے ہاں نہیں مل سکتے۔ وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں اُن

احساسات کو نہیں پا سکتے جو عشق و ایقان پیدا کرتے ہیں۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک   نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

ایمان و یقین کے مسرت و بہجت آمیز لمحات سے وہ قطعاً لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

مئے یقین سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز   نصیبِ مدرسہ یا رب یہ آبِ آتشناک

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟   دماغ روشن و دل تیرہ و نگاہ بے باک

اس نظامِ تعلیم میں تعلیم کو تعلیم کی خاطر نہیں حاصل کیا جاتا بلکہ اسے ملازمت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مدرسہ سے عموماً سطحی نظر کے لوگ نکلتے ہیں۔ مقابلہ کے امتحانات کے لئے طلبا مضامین کو اچھی طرح سے تیار کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد بھی امتحان تک ہی رہتا ہے بعد میں وہی نوجوان ان مضامین کی طرف توجہ بھی نہیں دیتے جو تعلیم شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کے لئے حاصل کی جانی چاہی تھی مادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے جب زاویہ نگاہ ہی مادیانہ ہوتا ہے تو آیندہ زندگی میں علم کی سچی محبت اور سوزِ یقین کی لازوال نعمت قطعاً میسّر نہیں آسکتی۔ اور اس علم سے دین زار زبوں ہو جاتا ہے اور حقائق پر نظر رکھنے والی چشمِ بصیرت سے اس کے تصوّر سے ہی جوئے خوں جاری ہو جاتی ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

جس علم کو تن پروری کے لئے حاصل کیا جائے وہ زندگی کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا بلکہ زہر کا اثر رکھتا ہے

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روا رو   اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں   جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

دانشِ حاضر کے بدترین اثرات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالج کا نوجوان ذہن و فکر کی تمام صلاحیتوں کو فرنگی تمدن کے تابع کر دیتا ہے۔ اہلِ فرنگ کی ہر تحقیق اس کے لئے وحی و الہام کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ انہی کے تخیلات کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے خیالات اپنے خیالات نہیں رہتے۔ تہذیبِ فرنگ یہاں تک

اس کے دماغ پر مستولی ہو جاتی ہے کہ اس کے تمام جذبات و احساسات فرنگی طریقِ فکر کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دانایانِ فرنگ کا جاہلانہ نظریہ اس کے لئے مسلّمات کی حیثیت رکھتا ہے۔ جن مسائل کے متعلق ابھی تک اس کے استادان تہذیب در ظنّ و تخمین میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اُن کے ان مسائل کی قطعیت میں ارتیاب و تشکک پیدا کرنے والے کو تنگ نظر جامد اور دقیانوسی ذہنیت والا کہکر ٹھکرا دیتا ہے۔ سائنس کی تحقیقات اور اکتشافات جدیدہ جن نظریات کے متعلق ابھی تک مکمّل نہیں ہوئیں وہ "تہذیب کا فرزند" اپنی طرف سے انہیں مکمّل سمجھ کر تفاخرِ علمی کا مظاہرہ کرنے لگ جاتا ہے۔ القصہ کالج کا نوجوان خود فراموشی اور زوالِ تحقیق کی لعنت میں گرفتار، مشرق کی تقلیدِ جامد سے نفور، جو مغرب کے افسوں سے مسحور، اپنے قوائے ذہن و فکر کو تہذیب فرنگ کی قربان گاہ پر ذبح کرنے کے بعد اپنے ربطِ حیات کے لئے بھی فرنگی زخمہ ور دل کا محتاج ہو جاتا ہے۔

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے!
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

فرنگ کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہونے کے بعد ان نوجوانوں کی جو حالت ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل مردہ دل اور کور ذوق ہو چکے ہیں کہ انکے سینے میں دل اور دل میں احساس فنا ہو جاتا ہے ان کی ساری زندگی تنہا عقل و خرد کے بل بوتے پر قائم ہو جاتی ہے اور جب تک ان کے سینے میں قلب حساس پیدا نہیں ہوتا جو انہیں "مومن خود کافر افرنگ شو" کا مصداق بنادے وہ تہذیب لادین کے آہنی چنگل سے مخلصی حاصل نہیں کر سکتے۔ اصل چیز دل کی بیداری ہے۔

ترا نومیدی از طفلاں روا نیست | چہ پروا گر دماغ شاں رسا نیست
بگو اے شیخِ مکتب گر بدانی | کہ دل در سینۂ شاں ہست یا نیست

اس نظامِ تعلیم میں تاریخ جو انسانی سیرت پر اثر انداز ہونے کے لئے سب سے بڑا عنصر ہے۔ نہایت ہی سطحی انداز میں پڑھائی جاتی ہے۔ زیادہ زور محاربات اور سیاسی انقلابات پر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اقوام کے

اخلاق۔ ان کے طرزِ معاشرت۔ ان کی تہذیب و تمدّن اور اسبابِ ترقی و انحطاط پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ نیز طلباء کے سامنے ان کی اپنی قومی تاریخ کے مستند پہلوؤں کو رکھا جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنی قومی روایات سے کما حقہٗ آگاہ ہو کر اپنے شاندار ماضی کو تصوّر میں لاتے ہوئے بہتر مستقبل بنانے کے لئے کوشش کریں۔ لیکن اس نظامِ تعلیم میں بجائے ہماری تاریخ کو مصادقہ اور مستند ماخذ سے مرتب کرنے کے غیر ملکی مصنفین کے شنیدہ علم اور قیاسی ڈھکوسلوں کو سرمایۂ تاریخ سمجھ کر نصاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس سارے نصاب میں ان علمی اور ادبی تحریکات کا کہ جس سے کہ قوم درجۂ کمال تک پہنچی اور ان داخلی اثرات کا کہ جنھوں نے جسمِ قوم میں زہرِ ہلاہل کا اثر کیا قطعاً ذکر نہیں کیا جاتا مثلاً مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ان کے اسبابِ زوال کو سیاسی انقلابات پر محمول کیا ہے اور قوم کی تہذیب و معاشرت اور اس کے اخلاقیات کے زوال و ارتقاء کو جو کہ فنِ تاریخ کی جان ہے بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہماری تاریخ کو جان بوجھ کر مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے مغربی سیاست کی مصلحتوں کے پیشِ نظر ان حقائق و عبر کو کہ جن سے ہماری ضعیف و درماندہ قوم کی مردہ رگوں میں خونِ زندگی پیدا ہونے کا خیال تھا دیدہ و دانستہ گوشۂ خمول میں رکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں تمام مضامین کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تاریخ سے بیدردانہ ناانصافی برتی گئی ہے۔ ہندوؤں کی پراچین تہذیب اور ان کے فلسفے کے تاثرات کو جزوِ نصاب قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام کی انقلابی روح اور اس کے عالمگیر پیغام کا ذکر بھول کر بھی نہیں کیا گیا مسلمان فاتحین کی زندگی میں ان کی اخلاقی قوت کو نظر انداز کر کے حرب و ضرب کی داستانوں کو متاعِ تاریخ سمجھا گیا ہے۔ درحقیقت "حکمتِ فرعونی" کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہ ہے کہ محکوم قوموں کے اخلاق ان کے مذہب۔ ان کی معاشرتی روایات اور ان کے ادب کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کرے جس سے وہ اقوام خود فراموشی کی افیون سے مدہوش ہو کر حاکم قوم کی تہذیب و ثقافت کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مکتب از تدبیر او گیرد نظام

تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام

اس نظامِ تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس سے شجاعت ۔ جوانمردی ۔ سخت کوشی اور پُردلی کے جذبات واحساسات کو کوئی دخل نہیں ۔ آزاد اقوام کے افراد میں اس نظام سے قومی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے اور وسائل وذرائع ہیں جو محکوموں کو میسر نہیں وہاں پر طلبا کو فوجی تربیت دینے اور قومی برتری برقرار رکھنے کے لئے حاکمانہ صفات پیدا کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے انتظام ہے ۔ لیکن غلام آباد ہندوستان میں کالج کا نوجوان فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاوارث اور یتیم بچے کی طرح بے یار ومددگار رہ جاتا ہے ۔

ہرزماں اندر تلاشِ سازوبرگ !

کار او فکر معاش و ترس مرگ

اس لئے اگر کوئی میدان رہ جاتا ہے تو وہ صرف ملازمت کا ہے ۔ اس لئے ابتدا سے ہی ہر طالب علم عیش و تنعّم کی زندگی کے خواب دیکھتا رہتا ہے ۔ زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے ۔ اس لئے ضبط نفس اور جہادِ زندگی کے جذبات اس میں قطعًا پیدا نہیں ہوتے ۔ طالب علمی کے زمانہ میں اس کی زندگی نسائیت اور تصنّع کی نامردانہ منازل سے دوچار ہوتی ہے ۔ اس زمانہ میں وہ اس سہل انگاری اور تن آسانی کی زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے کہ جفاکشی کی تمام صفات اسے "جنگلا پن" (Valgarity) نظر آتی ہیں ۔ فراغت تعلیم کے بعد اگر حسب منشا ملازمت مل گئی تو وہ عیش وتنعّم کی زندگی سے ہمکنار ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جاتا ہے ۔ اس وقت ہماری قوم میں وہ طبقہ جسے رجعت پسند کہا جاتا ہے ۔ اس قسم کے فرزندانِ تہذیب پر ہی مشتمل ہے ۔ جن کی معراج زندگی اچھا کھانا اور اچھا پہنتا ہے ۔

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن

نوجوانان چوں زنان مشغولِ تن

وہ نوجوان جو اس قسم کی اعلیٰ ملازمت حاصل نہیں کر سکتے وہ ادنیٰ ترین ملازمتوں کے پیچھے پیچھے پلے پھرتے ہیں اس ماحول میں ان کا اسلامی جذبہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے ۔ اور جرأت ۔ الوالعزمی اور حریت

کی مجاہدانہ صفات سے عاری رہ جاتا ہے۔

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے — نگاہِ او چو شیراں بے پناہے
بہ مکتب علم تیغش را آموخت — میسر نایدش برگِ گیاہے

یہ ہے نظامِ تعلیم جو ایک مسلم نوجوان کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سر بکف اور کفن بر دوش مردانہ وار میدانِ جہاد میں اترنے سے روک دیتا ہے۔ اور وہ اسرارِ حیات جو ایک مردِ مومن پر افشا ہوتے ہیں یہ نظام اس کے لئے سر بستہ و مقفل رکھ چھوڑتا ہے۔ یہ علم و فن تو ایک مسلمان کے لئے پیغامِ موت ہے!

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اس نظامِ تعلیم میں ایک وصف ضرور ہے کہ اس سے تنقید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور شخصیت پرستی اور تقلید سے ذہن آزاد ہو جاتا ہے لیکن یہاں افراط و تفریط کی خرابی پیدا ہوتی تو یہ احساسِ تشخص (Sense of Individualism) ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ مگر یہاں ہر حدود و قیود کو توڑ کر آزادیٔ فکر کا جو معیار قائم کیا گیا ہے۔ وہ انسان کو انسانیت سے گرا دیتا ہے اور وہی انسان جو کہ شرفِ انسانیت کا مبلغ بننے کا حقدار تھا۔ نوعِ انسانی کی ہلاکت و تخریب کے درپے ہو جاتا ہے اس میں خود رائی، عجب، گستاخی اور بے ادبی کی کمینہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں وہ اپنی عقل کو ہی دلیلِ راہ بناتا ہے اس لئے لامحالہ ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

آزادیٔ افکار ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس قسم کی جرأتِ افکار جس سے انسان مسلّماتِ دین کو عقل و خرد کے پیمانہ سے ناپنے لگ جائے اور اس میں محض اپنی رائے ہی کو حکم سمجھے یقیناً ابلیسانہ ہے۔ موجودہ نظامِ تعلیم نے اس قسم کے کئی منکرین پیدا کر دیئے ہیں جو ہستی باری تعالیٰ کے اس بنا پر منکر ہیں کہ انکی عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ علاوہ بریں بے ادبی اور گستاخی اس حد تک پہنچ چکی ہے۔ کہ معتقداتِ دینی کا استہزاء و استخفاف ان کا مشغلہ بن چکا ہے اسی قسم کے نوجوانوں کے متعلق حضرت علامہ مرحوم نے فرمایا ہے۔

نوجوانے را چو دیدم بے ادب — روزِ من تاریک می گردد چو شب

ادب سے ایمان و یقین پیدا ہوتا ہے۔ ادب سے نظام جماعت، اطاعت امیر اور ضبط نفس کی صفتیں حاصل ہوتی ہیں۔ بے ادب ان صفات سے عاری ہوتا ہے۔ اور اس لئے سوسائٹی کے لئے موجب فساد و تخریب ہے لیکن یہ نظام تعلیم اس کی جگہ گستاخی پیدا کرتا ہے۔

ادب پیرایۂ نادان و دانا است — خوش آں کو خود را بیاراست

ندارم آں مسلماں زادہ را دوست — کہ در دانش فزود و در ادب کاست

اس نظام تعلیم میں انگریزی ادب کی بدولت ایک نہایت ہی گمراہ کن نظریہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی بنیاد انگریزی شاعری میں رومانی (Romantic) دور سے پڑی ہے۔ آگے چل کر فن تعمیر، مصوری اور تمام فنون لطیفہ کو مقصود بالذات قرار دے کر حقائق زندگی کو نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کا اثر و نفوذ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ عصر رواں کی تہذیب میں زنا جیسی ملاکت آخر یہ معصیت کاری کو محض افراد کی "خوش وقتی" (Having a good Time) کہکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اور تمام راگ و رنگ عیش و نشاط کی محفلوں کو ذوق جمالیات (Aesthetic Taste) کا مظہر سمجھ کر سراہا جاتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے "اعصاب پر ہمیشہ عورت سوار رہتی ہے" یہی وجہ ہے نوجوان مصوری، تمثیل اور گل و بلبل کی شعر و شاعری کی طرف فن برائے فن (Art for Art's Sake) کے بے محابا جذبہ کی بدولت منہمک نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ تعلیم اسلام کے سراسر منافی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کو کسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں کوئی چیز بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی گئی۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

یہ نظام تعلیم صنف لطیف کے لئے اس کی زندگی کے مطابق نصاب پیش نہیں کرتا۔ بلکہ اصولاً ان کے لئے بھی وہی نصاب تعلیم ہے جو لڑکوں کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ اس نظام کے بدترین اثرات طلبہ اور طالبات دونوں طبقوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ جب مرد و زن کے واجبات زندگی الگ الگ ہیں تو ماہرین تعلیم کو چاہئے تھا کہ ان کے فرائض کی بجا آوری کے لئے حسب حال نظام تعلیم مرتب فرماتے لیکن افسوس کہ انہوں نے ان جنسی اختلافات

کو درخود اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ایک ہی نظام تعلیم تجویز کر دیا۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جو خرابیاں اس نظام سے پیدا ہو گئی ہیں وہ الم نشرح ہیں۔ یہ دونوں طبقے اپنے وظیفۂ زندگی کو نبھانے سے عاری ہیں۔ عورت۔ چراغ خانہ ہونے کی بجائے شمع بزم ہونے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ افزائشِ نسلِ انسانی کی بجائے ضبطِ تولید کو رواج دیا جا رہا ہے وہ عورت جس کی آغوش مرد غیور و حق پرست کے لئے اولین تربیت گاہ تھی وہ اپنے فرض سے متنفر ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ نظام تعلیم نے فرنگی معاشرت کے فواحش کی تمام روح ان طالبات کے اندر پیدا کر دی ہے اور اس کا نتیجہ ؟

کیا یہ ہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

ایک عورت کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہئے کہ وہ بہترین ماں بنے وہ صحیح معنوں میں گھر کی ملکہ ہے بچے کی ذہنی نشوونما میں سب سے زیادہ دخل اس کو ہے۔ لہٰذا اس کے لئے اس قسم کا نصابِ تعلیم چاہئے تھا جس میں اُس کا مقام اور اُس کے فرائض بالوضاحت بیان کئے جاتے۔ اور اسے بتایا جاتا کہ دنیا کی تمام صالحہ تگ و دو اس کے وجود سے وابستہ ہے۔

بردمد ایں لالہ زار ممکنات
از خیابانِ ریاضِ امہات

اس لئے تعلیم نسواں میں وہی نصاب تعلیم مناسب ہوگا جس میں عورت حدود نسوانیت کے اندر رہتے ہوئے اپنا وظیفۂ حیات پورا کر سکے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
سمجھتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت !
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اگرچہ اس نظام تعلیم کے مضرات کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ لیکن انہی مثالوں سے یہ

حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اس نظام سے ایک انسان شرفِ انسانیت کے بلند و بالا مرتبہ سے گر کر کس طرح حیوانیت کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔

یہاں پر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اس نصابِ تعلیم سے اہل فرنگ کی ترقی نہ رک گئی۔ وہ تو دن بدن مادی استیلا و غلبہ میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر اس نظام میں بنیادی نقائص ہیں تو ان کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا؟ اس اعتراض کا جواب نہایت آسان ہے۔ جو نظام تعلیم اہل فرنگ نے اپنے ملک کے لئے نافذ کیا اس میں آزادی رائے اور حریت ضمیر کا وہ جوہر بے بہا تھا جس کے سبب طالب علم کے دل میں تحقیق و تدقیق کا والہانہ جذبہ پیدا ہوتا ہے وہاں پہ حکومت کی شفقت اور حوصلہ افزائی نے طلبہ کے شوق اکتشاف و ایجاد کے لئے ایک زبردست قوت محرکہ کا کام کیا اور اس سے انہوں نے عناصر فطرت کی تسخیر میں قابل رشک انہماک کا ثبوت دیا۔ تمام علوم و فنون میں نئے نئے برگ و بار پیدا کئے۔ سائنس میں عدیم المثال ترقیات پیدا کیں۔ اپنے علم کے زور سے زمان و مکان کی پہنائیوں کو سمیٹ لیا اور قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ وہاں پر ان نوجوانوں کے لئے آئین جہانگیری و جہانبانی کے اصول شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ دنیا میں ان کی سیادت و قیادت مسلم ہے۔ دنیا کی دوسری اقوام اُن کے مقابلہ میں وحشی اور غیر متمدن ہیں۔ حکومت کرنے کا حق صرف انہیں ہی حاصل ہے۔

ان مردانہ صفات کی بدولت باوجود تمدنی خرابیوں کے اہل فرنگ کا نظام کچھ عرصہ کے لئے چل نکلا اگرچہ شراب کے نشہ کی طرح ابتدا میں ہوش و خروش کا مظاہرہ ہوا لیکن انجام کار اس تمدن کی بنیادی کمزوریوں نے باوجود ایجادات و اکتشافات کے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ خود ان کی سائنٹیفک ترقیات نے ہی ان کی موت کا سامان کیا۔ یورپ کی یہ اقوام جس برق رفتاری سے ہلاکت کے عمیق غار میں چلی جا رہی ہیں یہ نہایت ہی عبرت آموز منظر ہے۔ ان کی تمام ترقیات شعلۂ مستعجلہ کی طرح جلد ہی راکھ کا ڈھیر بنی جا رہی ہیں۔ ان کی اٹھان کو دو سو سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا کہ ان کا خورشید ارتقاء زوال پذیر ہو رہا ہے۔ حالانکہ قوموں کی زندگی میں دو سو سال کا عرصہ طرفۃ العین کے برابر بھی نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے ہاں حکومت نے اس سرزمین کو غیر متمدن سمجھ کر اپنی تہذیب و تمدن کے دھاروں کا رُخ ادھر ہی پھیر دیا۔ کیونکہ ہمارے ہاں اُن کو اگر کوئی کمی نظر آئی تو یہی کہ:-

جہاں قمار نہیں ان تنک لباس نہیں　　جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری

جسور زیرک و پُردم ہے بچۂ بدوی !!

نہیں ہے فیض مکاتب کا چشمۂ جاری

نظر وراں فرنگی کا ہے یہی فتویٰ !!

وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

اور نظام تعلیم اس قسم کا رائج کیا جسمیں ایجاد و اکتشاف کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ حکومت نے نوجوانوں کی مردانہ تربیت کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اسس کا نتیجہ یہ ہو کہ مغرب کی مادیت نے اپنے مخرّب اخلاق تمدن کے زہریلے اثرات سے ہر طالب علم کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا ان میں تحصیل علم و فن اور تسخیر و تحقیق موجودات کا جذبہ پیدا کرنے کی بجائے فرنگی بتکدے میں مقید کر کے دانش حاضر کی بت پرست، بت فروش اور بت گر فسون کاری کا پجاری بنا دیا۔ اور اس طرح مدنیت مغرب نے ہمارے سامنے نظام زندگی کو کھو کھلا کر دیا۔ اصول جہانبانی کی تعلیم دینے کی بجائے یہ تعلیم دی دی کہ تم اپنے ملک پر حکومت کرنے کے اہل نہیں ہو۔ تم آپس میں برسر پیکار رہتے ہو۔ اس لئے تیسری طاقت ہی نظم و نسق قائم رکھ سکتی ہے۔ تمہاری اپنی کوئی تہذیب نہیں۔ ہماری تہذیب کو نشان راہ سمجھ کر بام اوج پر پہنچ سکتے ہو حکومت نے اسی نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھکر کالجز قائم کئے انہیں اس نظام تعلیم سے علماء و فضلا پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی وہ تو اپنی ان فیکٹریوں (کالجز) سے حکومت کی مشینری کو چلانے کے لئے پرزے تیار کرنا چاہتے تھے۔

شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے

خریدتے ہیں فقط ان کا جوہر ادراک

غور کیجئے جہاں پر علوم و فنون کی تعلیم کے باوجود تمدنی خرابیوں نے اہل فرنگ کے لئے مصائب و آلام کے پہاڑ کھڑے کر دے اور وہ لب گور ہو گئے تو ہمارے ہاں کی بدبختی کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ جہاں پر علم و فن کی تعلیم کا تو کوئی انتظام نہ ہوا اور مخرّب اخلاق تمدن کو رائج کر دیا گیا جس کی تباہ کاریوں نے ہمارے ملک کو قیامت کا نمونہ بنا دیا۔ ہمیں چاہئے تھا کہ روح مدنیت تو اپنے ہاں کی ہی برقرار رکھتے اور تحقیقات جدیدہ کا علم اہل فرنگ سے حاصل کرتے۔ لیکن کیا یہ کہ اپنی مدنیت کو چھوڑ کر اہل فرنگ کی تباہ کن مادیت پرستانہ تہذیب کو ہی ترقی کا زینہ سمجھ کر لے لیا

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُو است — نے ز عریاں ساق و نے ز قطعِ مُو است

قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

فکر چالاکے اگر داری بس است

طبع درّاکے اگر داری بس است

یہ ہے ہمارا موجودہ دنیاوی نظام تعلیم۔ اب آئندہ قسط میں یہ بتایا جائیگا کہ ہمارا موجودہ دینی نظام کیا ہے۔ اور اس کے اثرات کیا ہیں۔ واللہ المستعان۔

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمانوں کی روزمرّہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدّن معاشرت کے خط و خال اس کی تعلیم و تہذیب۔ اسکے دنیاوی معاملات اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلّقات غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلبا کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ محصول ار

ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

حقائق و عبر

۱- ایک اہم گوشۂ فکر گذشتہ دسمبر میں یوپی مسلم لیگ کانفرنس (الہ آباد) نے ایک ریزولیشن (۳) امر کا پاس کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی مصنوعات استعمال کرنی چاہئیں۔ چونکہ اس ریزولیشن سے ہندو کی تاجرانہ اجارہ داری کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے ہندوستان ٹائمز نے اسپر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔

"یوپی مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ الہ آباد کی پاس شدہ قراردادوں میں سے ایک قرارداد میں مسلمانوں کو اپنی مصنوعات کے خاص طور پر اپنے بُنے ہوئے کپڑے کے استعمال کا مشورہ دیا ہے اگر مسلمان جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے ایک الگ قوم ہیں تو اس سلسلہ میں اُن کا یہ اقدام منطقی طور پر ترقی پر ورانہ ہے۔ لیکن ہم اُمید کرتے ہیں کہ خود مسلم لیگ اُسے اختیار کرنے سے قبل دو دفعہ پھر غور کریگی۔ کیونکہ اس طرزِ عمل کا دوسری اقوام کے مقابلہ میں خود مسلمانوں کے مفاد پر زیادہ بُرا اثر پڑے گا۔

اگر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی تیار کردہ اشیا کو ہی استعمال میں لائیں تو اس کے جواب میں دوسرے فرقے بھی اپنے افراد کو یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کی مصنوعات استعمال کریں۔ اور اگر ہندو اور سکھ اس قسم کی پالیسی اختیار کرلیں تو خود مسلمانوں کو اندازہ کرنا چاہئے کہ اسطرح سے وہ گھاٹے میں رہیں گے یا دوسرے فرقے۔ شکر ہے کہ دوسرے فرقے مسلم لیگ کی اس ہلاکت آفریں پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا خیال تک بھی نہیں رکھتے جسکی تلقین وہ مسلمانوں کو کر رہی ہے۔"

("ہندوستان ٹائمز ۲۷ دسمبر ۱۹۴۰ء)

اس تبصرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کسطرح اس کے ایک ایک لفظ سے ہندو کی تنگ نظری پست ذہنیت قومی عصبیت، نشۂ اقتدار سے لبریز دھکی اُبل رہی ہے۔ سب سے دلچسپ یہ ٹکڑا ہے کہ اگر دوسرے فرقے

(یعنی ہندوؤں) نے بھی "جواب میں" اس قسم کا رویہ اختیار کر لیا تو فرمائیے! کون خسارے میں رہیگا؟"

اللہ تیری شان کے قربان جائیے

گویا ہندوؤں نے آجتک کبھی یہ مسلک اختیار ہی نہیں کیا کہ وہ ہندوؤں اور صرف ہندوؤں کی بنائی ہوئی چیزیں خریدیں اور استعمال کریں۔ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ اس نے پورے ایک ہزار سال سے جب سے یہاں مسلمان وارد ہوا ہے مسلمانوں کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا ہو۔ آج اس قوم کے نمائندے یہ دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر ہم نے بھی اپنوں ہی کی بنائی ہوئی چیزیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو؟ ہندوؤں کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کے کھانے پینے کی کسی چیز میں کتا منہ ڈال جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اسے مسلمان چھو جائے۔ یا اس پر مسلمان کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ کھانے کے قابل نہیں رہ سکتی۔ آج سیاسی مصالح کے پیش نظر ہندوؤں کا دامن رواداری اچھوتوں تک کے لئے وسیع ہو رہا ہے۔ اور گاندھی جی اچھوت اُدھار کیلئے مرن برت تک رکھ رہے ہیں۔ لیکن مسلمان ان کے نزدیک بدستور اچھوت ہے۔ اس کے ساتھ معاشرتی تعلقات ویسے ہی ممنوع ہیں جیسے ایک ہزار برس پہلے تھے۔ مسلمان ہندوؤں کے نزدیک بھرشٹ ہے ملیکھش ہے۔ اچھوت سے بدتر ہے۔ ہندوؤں نے "تمام انسانیت" کی جو چہار گانہ تقسیم کر رکھی ہے۔ (یعنی ذاتوں کی تقسیم۔ برہمن۔ کھشتری۔ ویش شودر) ان میں مسلمان کسی ایک ورن میں نہیں آتا۔ حتیٰ کہ شودروں کے ورن میں نہیں آسکتا۔ پانچواں ورن جسے چنڈال کہتے ہیں۔ شاید اسمیں اس کے لئے کوئی جگہ نکل سکے۔ آپ وید۔ پران۔ شاستر جاننے والے کسی سناتن دھرمی ہندو سے پوچھئے کہ مسلمان۔ یا کوئی غیر ہندو کسی ورن میں آسکتا ہے۔ اول تو وہ کہیگا کہ ایسے انسان کے لئے "انسانیت" کی صف میں گنجائش نہیں۔ اور اگر وہ زیادہ وسعت نظر سے کام لیگا تو خیر۔ چنڈال کے ورن میں جگہ دیدیگا۔ آج جدید تعلیمیافتہ نوجوان مسلمانوں کے ساتھ ملکر کھا پی لیتے ہیں اس لئے نہیں کہ ان کا مذہب اسکی اجازت دیتا ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ بظاہر روادار اور وسیع مشرب بننا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان انھیں اپنا دوست سمجھیں اور اس دوستی کے پردے میں وہ ان کے سینے میں خنجر گھونپ دیں۔ اگر آپکی نگاہوں پر "قومیت پرستی" کی پٹی نہیں بندھی ہوئی ہے تو آپ عملی دنیا کے کسی شعبہ پر نگاہ ڈالئے آپ کو نظر آجائے گا کہ ایک ہندو جسقدر اپنے آپ کو "آزاد خیال" ظاہر کرکے مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی

قطعات قائم کرے گا وہ اتنا ہی زیادہ مسلمانوں کا دشمن ہوگا۔ اس ہندو کی یہ حالت ہوگی کہ مسلمانوں کے ساتھ ظاہراً رواداری کی خاطر کھانے پینے میں شریک ہو جائے گا۔ لیکن کبھی کسی مسلمان دوکاندار سے کچھ نہیں خریدیگا آپ مسلمان تاجروں سے پوچھئے کہ ان کے ہاں دن بھر میں کتنے ہندو خریدار آتے ہیں۔ ہندو اس وقت مسلمان کے ہاں جائے گا جب اُسے مطلوبہ شئے کسی ہندو کے ہاں نہ ملے گی۔ یعنی اسکا کسی مسلمان سے کچھ خریدنا نہایت مجبوری کے عالم میں ہوگا۔ ورنہ ہندو اپنا ایک پیسہ بھی کسی مسلمان کے ہاں بطیب خاطر بھیجنے پر رضامند نہیں ہوسکتا وہ مرتا مر جائے گا لیکن کبھی کسی مسلمان کو منتفع ہوتا نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں، صنعت و حرفت کے اداروں تھوک فروش دوکانداروں سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے خوردہ فروش۔ حتیٰ کہ خوانچہ برداروں تک کی یہ حالت ہے کہ ہندو سوائے مجبوری کے عالم کے کبھی کسی مسلمان سے کچھ نہیں خریدتا۔ ہندو کی تو یہ حالت ہے کہ وہ مذہبًا چمڑے کو ہاتھ نہیں لگایا کرتا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس صنف تجارت میں مسلمان ہی مسلمان نظر آتے ہیں۔ تو اس نے مذہب اور شاستر کے تمام احکامات بالائے طاق رکھ کر کھلے بندوں چمڑے کا کاروبار اپنے ہاتھ لے لیا اور آج آپ کو ہر جگہ اشیائے چرم کی بڑی بڑی دکانیں ہندوؤں کی نظر آئیں گی۔ آج تجارت کے ہر شعبے میں پورا پورا اقتدار ہندو کا ہے۔ وہ ملک میں واحد اجارہ دار ہے اور اگر کہیں کسی مسلمان کا کاروبار چمکتا نظر آتا ہے تو وہاں کے تمام ہندوؤں کی متحدہ کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح اُسے ناکام کر دیا جائے خواہ اُسمیں کچھ خسارا ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ خریداری تو ایک طرف رہی ہندو تجار اپنے ہاں کسی مسلمان کو ملازم نہیں رکھتے۔ جائیے کسی ہندو مل (کارخانہ) میں۔ اور دیکھئے کہ وہاں مسلمان ملازمین کی کتنی تعداد ہے۔ صرف ان چند آسامیوں پر مسلمان نظر آئیں گے جن کے لئے موزوں ہندو مل نہ سکتے ہوں۔ مسلمان ملازم رکھ لئے ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف یہ کوشش بھی جاری ہوگی کہ ان اسامیوں کے لئے بھی ہندوؤں کو ٹرینڈ کیا جائے۔ تاکہ وہ ان مسلمانوں کی جگہ سنبھال سکیں۔ یہ ہے وہ ہندو جو آج یہ دھمکی دیتا ہے کہ "مسلمانو! تم اپنے بھائیوں کو یہ سبق پڑھا رہے ہو کہ مسلمانوں کی بنی ہوئی چیزیں خریدو۔ اگر اس کے جواب میں ہم نے بھی ہندوؤں کو یہی کہنا شروع کر دیا تو کیا کرو گے؟"

اب اس مسئلہ کو آگے بڑھائیے۔ موجودہ "جنگِ آزادی" میں ہندو کا سب سے بڑا حربہ سودیشی کی تحریک ہے اور سودیشی میں بھی انگریزی کپڑے کا بائیکاٹ سب سے نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ اصولاً اس کے معنی کیا ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک لنکا شائر اور مانچسٹر کا انگریز غیر ہے۔ اس لئے غیروں کے ہاں کی مصنوعات ان کے نزدیک جائز نہیں۔ لہٰذا یہ اصول خود ہندوؤں کے ہاں بھی مسلّم ہے کہ اپنوں کے مقابلہ میں غیروں کی مصنوعات کا استعمال ترک کر دینا چاہیئے۔ ہندو کے نزدیک اپنے اور غیر کے فرق کا معیار وطنی حدود و قیود ہیں۔ لیکن مسلمان کے نزدیک اپنے اور غیر کا فرق اسلام اور کفر سے متعین کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک ہندو بھی ایسا ہی غیر ہے جیسا انگریز۔ اس لئے اگر مسلمان اس امر کا اعلان کرے کہ مسلمانوں کو غیروں کی مصنوعات کے مقابلہ میں اپنوں کی بنائی ہوئی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں۔ تو فرمائیے کہ اس سے ہندوؤں کے پیٹ میں درد کیوں اُٹھتا ہے۔ یہ اصول تو خود انہی کا قائم کردہ ہے۔ لیکن ہندو کیا جانے کہ اصول کسے کہتے ہیں۔ اس کے نزدیک اصول وہی ہے جس سے اپنے آپ کو فائدہ پہنچے۔

لیکن ہم ایک بات مسلمانوں سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر روز دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کا خرید و فروخت کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہے۔ وہ ہر گھڑی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہندو کبھی کسی مسلمان سے کچھ نہیں خریدیگا تاوقتیکہ وہ مجبور ہی نہ ہو جائے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ان کی غیرت کا کبھی تقاضا نہیں ہوتا کہ وہ ہندو کے اس شودرانہ سلوک کا کوئی بھی جواب دیں وہ نہایت ڈھٹائی سے ہندوؤں کے ہاں سے کھلے بندوں خرید و فروخت کریں گے اور اسمیں کبھی کوئی شرم محسوس نہیں کریں گے ہندوؤں نے اس ایک پالیسی سے مسلمان کا خون چوس لیا ہے۔ مسلمانوں کے افلاس اور ناداری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ساری کی ساری کمائی ہندوؤں کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ہاں سے ایک پائی بھی ان کی طرف نہیں آنے پاتی۔ اس اقتصادی جنگ میں مسلمان بُری طرح سے پسیا گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو ہوش ہی نہیں آتا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہم کسی قوم سے زیادتی کرنے کی تلقین نہیں کر سکتے اس لئے کہ ہمارا مذہب ہمیں زیادتی کی تعلیم نہیں دیتا وہ ہمیشہ عدل سکھاتا ہے۔ لیکن برابر

کا سلوک تو زیادتی میں شامل نہیں۔ قرآن کریم کا اس باب میں فیصلہ بالکل واضح ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (جس نے تمہارے اوپر زیادتی کی تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تمہارے اوپر کی ہے) اس لئے کیا اس ارشادِ خداوندی کے ماتحت مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا کہ ہندوؤں سے ویسا ہی سلوک کریں جیسا وہ ان کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور اگر اس سے بھی آگے بڑھا جائے تو قرآن کریم نے عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ) عدل و انصاف تمام دنیا کے ساتھ اور احسان اپنوں کے ساتھ۔ یعنی ان کے ساتھ جو وراثت کتاب الٰہی میں ان کے شریک ہیں۔ لیکن مسلمان کو اس سے کیا کہ غیرت کا تقاضا کیا ہے! اقتصادی ضروریات پکار پکار کیا کہہ رہی ہیں۔ اور اس کے خدا کا کیا حکم ہے! وہ تو جائے گا اور بلا تامل ہندوؤں کے ہاں سے سب کچھ خرید کر لے آئیگا اور نہیں سوچیگا کہ اس کے پیسے سے خود اسکی تخریب کے کس قدر سامان مہیا کئے جا رہے ہیں۔ مسلمان تو چراگاہ ہے جہاں ہر مخالف قوت اپنے گھوڑوں کو چراتی ہے اور پھر انہی گھوڑوں سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تو عام اشیاء کے استعمال کا تعلق ہے۔ لیکن ماکولات و مشروبات (کھانے پینے کی اشیاء میں) تو معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ شریعت اسلامی نے کھانے پینے کی اشیاء پر خاص پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ اور ان کے نزدیک حلال و حرام اور خبیث و طیب کا امتیاز انہی حدود و قیود کی رو سے کیا جاتا ہے۔

مشرکین کے متعلق قرآن کریم میں بصراحت موجود ہے۔ کہ "اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ" (مشرکین نجس ہیں) اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ نجاست اور پاکیزگی میں باہمی کیا میل ہو سکتا ہے۔ کہدیا جاتا ہے کہ نہیں صاحب۔ اس نجاست سے نجاست معنوی مراد ہے۔ بہت اچھا۔ یونہی کہدیجئے۔ لیکن یہ تو دیکھئے کہ قرآن کریم کس طرح نجاستِ معنوی کے اعتبار سے انہی چیزوں کو کھانے پینے کی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ آپ کے سامنے نہایت عمدہ۔ تر و تازہ انگوروں کا خوشہ رکھا ہے۔ آپ اسکی طرف ہاتھ بڑھاتے ہی ہیں کہ آپ کو

بتایا جاتا ہے کہ یہ انگور غیر اللہ کے نام پر بطور نذر دیئے گئے تھے۔ قرآن کریم کی نصِ صریح کے مطابق یہ انگور حرام ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ انگوروں میں کوئی ظاہر انجاست تو لگ نہیں گئی۔ غیر اللہ کی نسبت سے شرک کی معنوی نجاست ہی تو پیدا ہوئی ہے۔ اس معنوی نجاست کے اعتبار سے ایک صاف ستھری شے خبیث اور حرام قرار پا گئی۔ یا مثلاً ایک بکرے کو اگر کالی ماتا کے نام پر ذبح کیا جائے "اور طریق ذبح" بعینہٖ وہی ہو، جو مسلمانوں میں مروج ہے تو ہر چند اس بکرے کا گوشت صاف، ستھرا ہوگا۔ لیکن ایک توحید پرست کیلئے حرام قرار پا جائے گا۔ اسمیں بھی تو شرک کی معنوی نجاست ہی شامل ہے ظاہری نجاست تو کوئی نہیں۔ سو جب شرک کی معنوی نجاست سے یہ چیزیں یوں حرام قرار پا جاتی ہیں تو مشرکین کی معنوی نجاست اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ شریعتِ اسلامی کی رُو سے مشروبات و ماکولات کے پاکیزہ (طیّب) ہونے کے لئے مختلف شرائط مقرر ہیں۔ مثلاً ایک کنویں میں اگر ایک چوہا گر جائے تو جب تک شرعی قاعدہ کے مطابق اسمیں سے ایک معیّنہ مقدار کا پانی نہ نکالا جائے اس کوئیں کا پانی طیّب (پاکیزہ) قرار نہیں پا سکتا خواہ یوں وہ پانی کتنا ہی صاف۔ ستھرا کیوں نہ ہو۔ وقس علےٰ ہذا۔ اب ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے ہاں کی تیار شدہ ماکولات و مشروبات کے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اس باب میں پاکیزگی کے ان اُصولوں کو پیش نظر رکھا ہے جو شریعت اسلامی کے مطابق ضروری ہیں۔ اس لئے ایسی چیزوں کا استعمال شرعاً کیسے ہو سکتا ہے؟ اسمیں شبہہ نہیں کہ مسلمان دُکاندار بھی اکثر گندے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ یہ چیز، تو بہرحال ایسی ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔ گندہ اور غلیظ کوئی ہو۔ اس سے پرہیز لازمی ہے لیکن سوال تو وہاں سامنے آتا ہے جہاں صاف ستھری چیزیں سامنے ہوں۔ ایک ہندو کے ہاں کی چیزیں صاف ستھری ہو سکتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کی تیاری میں شریعت اسلامی کے مطابق پاکیزگی کا خیال رکھا گیا ہو۔ لیکن ایک مسلمان کے متعلق تو یہی باور کیا جائے گا کہ اس نے شرعی پاکیزگی کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان حالات کے ماتحت فرمائیے کہ ہندوؤں کے ہاں کی ماکولات و مشروبات کس طرح شرعاً پاکیزہ خیال کیجا سکتی ہیں۔

تصریحات بالا پر غور کیجئے اور سوچئے کہ مسلمانوں پر اس باب میں کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ ہندوؤں نے محض اقتصادی اجارہ داری کی بنا پر مسلمانوں کا عملاً بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ وہ نہ ان کے ہاں کی مصنوعات خریدتے ہیں۔ نہ ماکولات و مشروبات کو چھوتے ہیں۔ لیکن مسلمان شرعی احکام کے باوجود اس باب میں کبھی کوئی تمیز نہیں برتتے۔ مسلمانوں کی یہی مجرمانہ غفلت شعاری ہے جسکی طرف یو پی مسلم لیگ کی کانفرنس نے توجہ دلائی ہے ان سے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ ہندوؤں نے اس تجویز کے خلاف شور مچا دیا۔ لیکن مسلمانوں کی بے حسی ملاحظہ ہو کہ کسی جگہ نہ اس تجویز کا چرچا ہوا نہ اسپر عمل پیرا ہونے کے لئے کوئی اقدام کیا گیا۔

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں !

۲۔ واردھا اسکیم

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی متعینہ کمال یار جنگ کمیٹی نے دورہ کے بعد اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ اس کمیٹی کے پیش نظر جو کام ہے اسکی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ دراصل تعلیمی نظام ہی کسی قوم کے افراد کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو اسکی تہذیب و تمدن کے حسب منشا مرتکز کر سکتا ہے۔ قومی زندگی میں اس وقت تک انقلاب ناممکن ہے۔ جب تک کہ اس کے افراد کی قلبی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور وہ بہترین ہیئتِ اجتماعیہ جسے اسلام کہا جاتا ہے اس وقت تک خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس کا وجود اسکے حاملین کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ اس وقت اس نظام الٰہی کے مطابق سوسائٹی کا تخیل پیدا کرنے اور اسکی صداقت کو مبرہن کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پالیسی فوراً بدلنی چاہیئے۔ مسلمانوں کے لئے وہی نظامِ تعلیم مفید اثرات کا حامل ہو سکتا ہے جسکی بنا اسلامی عقائد و افکار پر ہو۔ ہر وہ نظامِ تعلیم جو غیر اسلامی ہو۔ خواہ ملکیوں کا تجویز کردہ ہو جیسے وردھا اسکیم۔ خواہ، غیر ملکیوں کا جیسے متداول نظام مسلمانوں کی نگاہ میں مردود ہے۔ انہی حقائق کے پیش نظر اس کمیٹی نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ وردھا کی "بنیادی تعلیمی اسکیم" ان کی تہذیب و ثقافت کے انعدام کا سب سے بڑا مہلک حربہ ہے۔ یہ ایک واضح بات تھی۔ لیکن ہندو کی متعصبانہ ذہنیت اس تلخ حقیقت کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اپنی اس ذہنیت کا اظہار کرتے ہوئے ہندو جاتی کے ناقوس سے یہ صدا بلند ہوئی۔ کہ :۔

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی کمال یار جنگ کمیٹی نے (جو ریاست حیدرآباد کے اس رئیس کی مالی امداد سے چل رہی ہے) اپنی ابتدائی رپورٹ میں بنیادی تعلیمی اسکیم کو مسلم کلچر کے خلاف نبرد آزما بتایا ہے۔ جب تک یہ کمیٹی اپنے سیاسی تعصب کو ترک کرنے اور تعلیمی معاملات میں مسلم لیگ کے آلۂ کار بننے کا خیال نہیں چھوڑ دیتی وہ اس اسکیم کے متعلق غیر متعصب ماہرین تعلیم کی بے لاگ رائے کو معلوم نہیں کرسکتی۔"

(ہندوستان ٹائمز ۱۴ ۱ ۴۶)

موجودہ سیاسی کشمکش میں ہندو (بلکہ تمام قومیت پرست طبقہ) کی یہ عام روش ہے کہ مسلم لیگ جو کچھ کہے۔ اس کے متعلق فوراً کہہ دیا جائے کہ انگریز کا آلۂ کار بنکر یہ کچھ کیا گیا ہے۔ اور اگر کوئی اور اسلامی ادارہ کچھ کہے تو اسکے متعلق کہہ دیا جائے کہ یہ مسلم لیگ کا آلۂ کار ہے۔ یعنی ہندوؤں کے نزدیک جیسا کہ اگلے دنوں کانپور کے ایک پرنسپل صاحب نے کہا ہے۔ سچائی پر صرف وہی ہو سکتا ہے جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتا جائے۔ باقیوں کی نہ اپنی رائے ہو سکتی ہے نہ حق و صداقت ان کے ساتھ۔

"واردھا کی تعلیمی اسکیم" کیا ہے اور کسطرح مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تخریب کے لئے یہ زہر میں بجھے ہوئے نشتر۔ حریر و اطلس کے نظر فریب غلافوں میں چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ ہم اسکی تشریح اپنے شائع کردہ پمفلٹ میں بالوضاحت کر چکے ہیں۔ اُسے ایک مرتبہ پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ کمال یار جنگ کمیٹی نے جو کچھ لکھا ہے وہ کسطرح حرف بحرف صحیح ہے۔ اس باب میں ایک دلچسپ چیز قابل غور ہے۔ جمعیت علمائے اپنے دہلی کے اجلاس میں اس اسکیم کی سخت مخالفت کی تھی۔ اور اعلان کیا تھا۔ کہ اگر کانگریس نے اسے تبدیل نہ کیا تو وہ اس کے خلاف سول نافرمانی کرینگے۔ آج اس بات کو قریب دو برس ہونے کو آئے یہ اسکیم ہر جگہ جاری ہے۔ اور جمعیت العلماء کے صادق الوعد اور رئیس الاحرار حضرات کی زبانِ فیض ترجمان سے ایک لفظ بھی اسکے خلاف نہیں نکلا۔ دیکھا آپنے! ہندو کے پاس کتنا بڑا جادو ہے جس سے وہ یوں زبانیں بند کردیتا ہے۔ وہی سامری کا بچھڑا جو سونے اور چاندی کا تیار کیا گیا تھا۔

ہم نے کمال یار جنگ کمیٹی کی ابتدائی رپورٹ کو ابھی نہیں دیکھا۔ اس لئے اس کے متعلق تفصیلی طور پر اظہار رائے سے معذور ہیں۔

۴۔ ثالث بالخیر سر تیج بہادر سپرو کا ایک بیان بسلسلۂ مفاہمت ۱۴ جنوری کے ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے۔ اس بیان میں سر موصوف نے گفت گوئے مصالحت کے لئے بحیثیت ثالث جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے متعلق ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پھر دونوں اقوام کے بنیادی اختلافات کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے متحدہ قومیت کے مردود و نامقبول نظریہ کو منزل مقصود قرار دیا ہے حالانکہ یہ حقیقت اب الم نشرح ہو چکی ہے کہ مسلمان کسی دوسری قوم کے ساتھ ملکر متحدہ قومیت پیدا ہی نہیں کر سکتے۔ سر موصوف اس حقیقت کے علم کے باوجود پھر وہی رٹ لگا رہے ہیں کہ متحدہ قومیت قائم کی جائے۔ حالانکہ اگر وہ صحیح معنوں میں ثالث بالخیر ہوتے تو کہتے کہ ان دو نظریوں میں جو شے قدر مشترک نظر آتی ہے اسپر مفاہمت کی جائے۔ لیکن آخر وہ بھی تو ہندو جاتی کے سپوت ہیں۔ وہ کسطرح اس حقیقت ثابتہ کو کہ مسلمانوں کو علیحدہ قومی وطن دیا جائے ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیان میں جس انداز سے گاندھی جی کی وکالت کی ہے، وہ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"کیا مسلمان اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ ہندوستان ان کا وطن ہے اور صدیوں سے ان کا وطن رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو علیحدہ قوم تسلیم کریں یا نہ کریں آخر انھیں رہنا تو اسی ملک میں ہی ہے۔ کیا خوش سمالگی۔ انصاف اور خرد کا یہ تقاضا نہیں کہ اگر بعض اقلیتیں اپنے مذہبی۔ ثقافتی۔ اقتصادی اور سیاسی تحفظات کی ضرورت محسوس کریں تو انھیں اس قسم کے تحفظات دیئے جائیں۔۔۔۔۔ میری ناچیز رائے میں دن رات اس بات پر عالمانہ بحث کرنا کہ آیا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں یا الگ الگ دو اقوام محض تضیع اوقات ہے۔ آج سے پچاس سال قبل لڑکپن کے زمانہ میں جب اسکول یا اسکول سے باہر میں اپنے اقران و اماثل سے ملتا تھا تو میں نے اور نہ انھوں نے کبھی یہ خیال تک

بھی کیا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔۔۔۔ ہندوؤں کے لئے اس سے بڑھکر اور کیا حماقت ہوگی کہ وہ گذشتہ سات سو سال کی تاریخ کو مٹا ڈالیں اور خیال کرنے لگیں کہ ہندوستان صرف انہی کا وطن ہے۔ اور اسی طرح سے مسلمانوں کا خیال بھی فضول ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے علیحدہ کرنے کے بعد ہی اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس ملک میں امن چاہتے ہیں اور نہایت ہی ہموار طریقہ پر ملکی ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں جان لینا چاہئے کہ اکثریت اور اقلیت کے تمام فرقے ملک کے استحکام کے لئے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام کا مشترکہ فرض ہے کہ وہ نہ صرف آزادی حاصل کریں بلکہ اس کے برقرار رکھنے کی بھی کوشش کریں"۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴ ۱/۴۷ء)

کیا بعینہٖ وہی راگ نہیں الاپا گیا جو سابرمتی آشرم کے "سامری" کی دیرینہ منطق کا آئینہ ہے۔ غور فرمائیے یہ صاحب ثالث بالخیر بن کر آئے ہیں اور جانبداری کی یہ حد ہے کہ مسلم لیگ کے تمام بنیادی معاملات کو تو باطل ٹھہراتے ہیں لیکن کانگریس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں فرماتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک غیر مسلم کبھی غیر جانبدار ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تمام معاملات کو اپنے نظریات کی روشنی میں دیکھتا ہے اور باوجود حق و انصاف کو جانتے کے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر نصفت شعاری اور عدالت گستری کسی کا شیوہ ہو سکتا ہے تو وہ مسلمان ہی کا ہے۔ جس کو واضح طور پر حکم دیا گیا ہے کہ:۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

(کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کا دامن چھوڑ دو۔ تمہیں بہرحال انصاف کرنا چاہئے۔ کیونکہ انصاف احکام الٰہی کی پابندی کے زیادہ قریب ہے۔)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۰

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوعِ اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو۔ اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی کارڈ) رکھ دیا جاتا ہے جو ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے اور قیمت فی پرچہ ۸؍ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی پی طلب کرنے کے بعد اسے موصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پورا پتہ اور صاف لکھیئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمایئے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں۔ اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "طلوعِ اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملّت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ وَاللہُ الْمُستعان

(۱۳) تازہ پرچہ قیمتاً اور نمونہ کا پرچہ مفت ارسال کیا جائے گا۔

ناظم:۔ ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.